اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مئی ۲۰۱۲ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان

جلد۱۶، شمارہ ۵ مئی ۲۰۱۲ء/ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ

مشمولات

مثالیت پسندی سے عملیت پسندی تک		۲
Oتعلیم و تربیت		
دینی مدارس کے لیے نیا نصاب (آخری قسط)	مولانا حسین احمد مدنیؒ	۳
دینی مدارس کے علماء کرام سے چند کھری کھری باتیں	مولانا محمد خاں شیرانی	۹
Oہمارا دینی تناظر		
اتحاد بین المسالک	ثاقب اکبر	۱۵
تعلیم مسلسل کا شاندار نظام، فرقہ واریت کی زد میں	پروفیسر ملک محمد حسین	۲۳
Oپاکستانیات		
ہم کرپٹ قوم کیوں ہیں؟	ڈاکٹر محمد امین	۲۷
Oتزکیۂ نفس		
منافقت اور اس کا علاج	احمد جاوید	۳۱
Oاسلام اور مغرب		
مغربی تہذیب کا چیلنج اور ہماری ذمہ داریاں اصل چیلنج داخلی ہے	احمد جاوید	۳۴
سائنسی علمیت اور اسلام (آخری قسط)	پروفیسر زاہد صدیق	۴۳
Oتبصرہ کتب		
ترکی میں حدیث کی موضوعاتی تدوین	مدیر	۵۳

مثالیت پسندی سے عملیت پسندی تک

ستمبر ۱۹۸۶ء میں ہم نے چند دوستوں کو جمع کیا اور تعلیم میں مطلوب کاموں پر سوچ بچار شروع کی۔ وہ دن اور آج کا دن اک خواب آنکھوں میں ٹھہر گیا ہے۔ ثنویت کے خاتمے کا، تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کا، دینی و دنیاوی تعلیم کی یکجائی کا، ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کا، تاکہ اسلامی تناظر میں اور عصری حوالے سے فرد کی متوازن تعلیم و تربیت ہو سکے۔

ربع صدی کے اس سفر کے حاصلات پر جب ہم اپنا احتساب کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم مثالیث پسندی کے دائرے کے اندر سفر کرتے رہے ہیں۔ ہم اپنے خواب سے نہیں ہٹے لیکن درپیش حقائق کا لحاظ بھی نہیں رکھ پائے۔

اور یہ کہ اسلاف کا طرز عمل (خصوصاً ان بزرگوں کا جنہوں نے لوگوں کی اصلاح کرکے ان کے دل و دماغ کو بدلا بھی ہے) کہ اپنے لوگوں کی اصلاح کرو، جتنی ہو سکے۔ غیر ملائم ماحول کو انگیخت کرتے ہوئے اور موجود حقائق کا لحاظ کرتے ہوئے۔ اور اصلاح کا یہ طرز عمل تقاضا کرتا ہے عملیت پسندی کا نہ کہ مثالیت پسندی کا۔ اپنے آئیڈیلز کو چھوڑنا نہیں چاہیے لیکن اگر ایک جست میں بآسانی منزل پر نہ پہنچا جا سکتا ہو تو سنگ ہائے راہ کو انگیخت تو کرنا پڑے گا اور آخری منزل تک پہنچنے کے لیے جگہ جگہ خیمے تو نصب کرنے پڑیں گے اور تاریک راتوں میں سرد ہواؤں کا سامنا تو کرنا پڑے گا۔

تعلیم و تربیت　　　　مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

دینی مدارس کے لیے نیا نصاب (آخری قسط)

اصول مخصوصہ نصاب درجہ عالیہ (سینئر) مدت تعلیم ۸ سال

۱۔ چونکہ علم حدیث وتفسیر تعلیم اسلامی کے مقاصد عالیہ مہمہ میں سے ہے اس لیے ان دونوں کو اس درجہ میں داخل کیا گیا ہے۔

۲۔ ہر ہفتہ میں جمعرات کے آخری حصہ میں حسبِ اوقات مذکورہ نصاب پر تقریر کرانا چاہیے۔

۳۔تقریر کے لیے ہر ہفتہ میں مدیر تقریر طلبہ کو مضمون دیدے کہ آئندہ جمعرات کو تم کو فلاں مضمون پر تقریر کرنی ہوگی۔

۴۔ سال ثالث سے طلباء درجہ کو زبان ہائے مذکورہ میں سے ذیل میں سے کوئی ایک زبان سیکھنی ہوگی: سنسکرت، برہمی، سیامی، تامل کھاسیا اوڑیا وغیرہ تا کہ بوقت ضرورت ان ملکوں میں تبلیغ کر سکیں۔

۵۔ ہفتہ میں ایک گھنٹہ ان زبانوں کے سیکھنے کے لیے صرف کرنا ہوگا جو کہ تقریر کے گھنٹہ میں سے جدا کیا جائے گا۔

۶۔ سال ثالث اور اس کے بعد کے طلباء کو بعد از نماز جمعہ مجلس مناظرہ منعقد کرنا ہوگی اور اس میں حسب تفصیل مذکورہ نصاب پر باقاعدہ بحث جاری کرنی ہوگی۔

۷۔ مناظرہ کے لیے بھی مدیر مناظرہ طالب علموں کو ایک ہفتہ پہلے مبحث معین کر دے گا اور مسئلہ کے ہر دو پہلو پر اس درجہ کے طلباء دو فریق کر دیے جائیں گے اور تمام ہفتہ کے خالی اوقات میں کتب مذہب و مناظرہ دارالمناظرہ سے لے کر طلباء مطالعہ کریں گے۔ مدیر مناظرہ مجلس مناظرہ کا پریذیڈنٹ ہوگا اور وہ آپس میں تصفیہ کرے گا اور انتظامی طریقہ پر سب کو کاربند رکھے گا۔

نصاب تعلیم درجہ عالیہ (سینئر) مدت تعلیم ۸ سال

مقدار زمانی	کتب درسیہ	مقدار اوقات ہفتہ	کیفیات ومحلات کتب
سال اول	تفسیر عزیزی نصف پارہ عم فارسی الدروس العربیہ نمبر ۳و۴ للغالینی الفیہ ابن مالک اخیر مرفوعات تک نفحۃ الیمن باب اول ملتقی الابحر کتاب الصلوٰۃ، ازہار العرب مجموع الادب فی فنون العرب تہذیب وشرح تہذیب للیزدی چہل حدیث مولوی اصغر حسین دیوبندی واربعین نووی، کو کھلے کی تقریریں، فصول اکبری تاریخ سلاطین ہند عہد اسلام مصنفہ اکبر خان نجیب آبادی تاریخ حروب صلیبین از شرر لکھنوی مشق تقریر در بنگلہ وانگریزی	تفسیر ۱ گھنٹہ و حدیث ۱ گھنٹہ صرف ۱ گھنٹہ، ادب عربی ۵ گھنٹہ، فقہ ۵ گھنٹہ، منطق ۴ گھنٹہ، تاریخ ۳ گھنٹہ، اقتصادیات ۲ گھنٹہ، دستکاری ۲ گھنٹہ، دارالمطالعہ ڈیڑھ گھنٹہ، تقریر آدھا گھنٹہ	۱۔ یہ کتابیں بمبئی، بھنڈی بازار، ۹ میں شرف ادلین کی دکان سے ملے گی۔ ۲۔ ملتقی الابحر بمبئی میں بھنڈی بازار ابناء غلام محمد سورتی کے یہاں ملتی ہے۔ ۳۔ ازہار العرب جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملتا ہے۔ مجموعہ الادب فی فنون العرب شرف الدین کی دوکان سے بمبئی میں ملتی ہے۔ ۴۔ چہل حدیث دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور سے ملتی ہے۔ ۵۔ بمبئی، بھنڈی بازار ابنا غلام محمد سورتی کے یہاں ملے گی ۶۔ الناظر بک ڈپو لکھنو سے ملتی ہے۔ تاریخ سلاطین اسلام در ہند مصنفہ اکبر خان نجیب آبادی چونکہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے تا طبع تاریخ سلاطین ہند رائج جامعہ عثمانیہ دکن پڑھائی جائے۔ ۸۔ تاریخ حروب صلیبیہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملتی ہے۔

سال دوم	بقیہ تفسیر عزیزی سورہ عم، بقیہ الفیہ ابن مالک و ابن عقیل، اصول شاشی قطبی تصدیقات، مقامات حریری۔ ۲۔ مقالہ	تفسیر ۲و ۳ حدیث ۱، نحو ۶، ادب و عروض ۱، فقہ و اصول ۱، منطق ۲، تاریخ ۲، دستکاری ۲، درالمطالعہ ۱، تقریر آدھا گھنٹہ	۱۔ احیاء السنن خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر سے ملے گی۔ ۲۔ یہ دونوں کتابیں کتب خانہ ابناء غلام محمد سرور بھنڈی بازار بمبئی سے ملتی ہے۔ ۳۔ خوشحال برطانوی ہند الناظر بک ڈپو لکھنو سے ملتی ہے۔ ۴۔
سال ثالث	تفسیر عزیزی پارہ تبارک الذی تلخیص المفتاح کامل و مختصر، معانی فن اول شرح نقایہ لملا علی القاری یا شرح وقایہ نصف اول، نور الانوار کامل، قطبی تصورات معہ میر بقیہ مقامات دیوان متنبی، اعلاء السنن کتاب الاثار للامام محمد رحمہ اللہ علیہ شرح ثمرقندیہ فی الاستعارات یا شرح تحفۃ الاخوان للدریر، معاشیات ہند للبرانی نصف اول، آئینہ حقیقت نما مصنفہ اکبر خان نجیب آبادی (ترجمہ نفح الطیب تاریخ اندلس و اسپین۔	تفسیر و حدیث ۶ گھنٹہ معانی و بیان ۶، فقہ و اصول ۲، منطق ۲، ادب ۳، تاریخ و اقتصادیات ۶، دستکاری ۲ دارالمطالعہ ۵.۱ اور تقریر ۵.۱ گھنٹہ	بھنڈی بازار بمبئی ابناء علی محمد سورتی سے اس کو منگوا سکتے ہیں مگر اس کی عدم موجودگی میں شرح وقایہ پڑھائی جائے۔ ۲۔ اعلاء السنن اشرف المطابع تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ۳۔ شرح سمرقندیہ بمبئی کے دوکانوں سے ملتی ہے اگر وہ نہ ملے تو شرح تحفۃ الاخوان للدردیر مطبوعہ شرف الدین بھنڈی بازار بمبئی سے ملے گی۔ معاشیات ہند للبرنی اسلامی یونیورسٹی علی گڑھ مقتدی خان شروانی کے کتب خانہ سے ملے گی۔ ۵۔ آئینہ حقیقت نما مدیر عبرت نجیب آبادی ضلع بجنور، ۶، جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملے گی۔

سال رابع	تفسیر عزیزی پارہ الم۔ بقیہ مختصر معانی توضیح کامل سلم، العلوم دیوان حماسہ، ہدایہ اولین رشیدیہ فی المناظرہ سراجیہ المحاسن والاضداد للجاحظ، موطا للامام محمد رحمہ اللہ، الفوز الکبیر اردو للشیخ ولی اللہ الدہلوی، آئینہ حقیقت نما حصہ ثانی، معاشیات ہند نصف ثانی (تاریخ ترکیہ جدیدہ اور سلطان نورالدین محمود) (تقریر عربی و اردو)	تفسیر ۳، حدیث ۳، معانی ۳، اصول ۳، مناظرہ ۱، منطق ۳، ادب ۳، فقہ ۵، فرائض ۱، اصول تفسیر ڈیڑھ گھنٹہ ،اقتصادیات ڈیڑھ گھنٹہ، دستکاری ۱، دارالمطالعہ آدھا گھنٹہ، تقریر ۔	۱۔ المحاسن والاضداد للجاحظ بمبئی کے کتب خانوں سے ملتی ہے۔ ۲۔ الفوز الکبیر اردو جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملتی ہے۔ ۳۔ الناظر بک ایجنسی لکھنو سے ملتی ہے۔
سال خامس	جلالین نصف اول ہدایہ آخرین شرح مسلم الثبوت لبحر العلوم۔ المسمی بفواتح الرحموت تا آخر مبحث کتاب، سبعہ معلقہ دیوان معری تصریح الافلاک، ہدایہ سعیدیہ ،شرح عقائد النسفی، شرح نخبۃ الفکر، شمائل ترمذی	تفسیر ۴، وحدیث ۳ گھنٹہ، فقہ ۶ ، اصول ۳ گھنٹہ، ادب عربی ۳، بلاغت ۱، اصول حدیث ۱	۱۔ سیاسیات اجمل خان بی اے۔ الناظر بک ڈپو لکھنو سے ملتی ہ۔ ۲۔ شرح عقود الجمان بمبئی کے کتب خانوں سے ملتی ہے۔ ۳۔ یہ کتاب مصر میں فرج اللہ زکی نے معہ المستصفی فی الاصول چھاپی ہے۔ بمبئی کے کتب خانوں سے ملے گی۔ نولکشور کی مطبوعہ کتاب نہایت

	شفاء قاضی عیاض، سیاسیات در، اصول سیاستہ اجمل خان الہ آباد ، شروح عقود الجمان للسیوطی آئینہ حقیقت نما حصہ ثالث (تاریخ افغان جدید)، مشق مناظرہ باعیسائیان۔ (ہندوستان درعہد اورنگ زیب مصنفہ مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب)		غلط ہے۔شرف الدین بھنڈی بازار بمبئی سے ملتی ہے۔ از حلقہ نظام المشائخ دہلی سے ملے گی۔
سال سادس	بقیہ جلالین، مشکوٰۃ المصابیح بقیہ، شرح مسلم الثبوت از بحر العلوم، شرح چغمینی مسامرہ شرح مسائرہ۔ شرح عقیدہ طحاویۃ، الفیہ العراقی فی اصول الحدیث، ادب الکتاب للصولی مطبوعہ بیروت نصف اول اصول، السیاسۃ نصف اول لی کان ۔ اسوہ صحابہ از عبدالسلام ندوی آزادئ ہند مصنفہ انڈریوز۔ مشق مناظرہ باآریہ	تفسیر ۴، حدیث ۱۲، اصول فقہ ۴، اصول حدیث ۲، عقائد ۳، ہیئۃ ۲، ادب ۲، اصول سیاست ۲ گھنٹہ، دستکاری آدھا گھنٹہ، تقریر آدھا گھنٹہ۔	۱- یہ دونوں کتابیں دارالاشاعت دیوبند ضلع سہارنپور سے ملیں گی۔ ۲- مطبعہ یوسفیہ فرنگی محل لکھنو سے ملتی ہے۔ ۳- یہ کتاب بمبئی کے کتب خانوں سے ملتی ہے۔ ۴- یہ کتاب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے ملے گی۔ ۵- الناظر بک ایجنسی سے ملتی ہے اور دوسری جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے ملے گی۔

سال سابع	بیضاوی شریف ثلث اول، ترمذی شریف، مسلم شریف، ابن ماجہ بقیہ ادب الکتاب للصولی۔ حجۃ اللہ البالغہ نصف اول، بقیہ اصول سیاست لی کان (بدایۃ المجتہد لابن رشد مطالعہ)، مشق مناظرہ باقادیانیاں و شیعہ وغیرہ تحریرات عربیہ۔	تفسیر ۹، حدیث ۱۵، ادب ۳، حکم شریعت ۲، دارالمطالعہ آدھا گھنٹہ، تقریر آدھا گھنٹہ، دستکاری ۲، سیاسیات ۲ گھنٹہ۔	ا۔ یہ کتاب بمبئی بھنڈی بازار نمبر ۹ شرف الدین سے ملتی ہے۔
سال ثامن	بقیہ بیضاوی شریف تمام۔ بخاری شریف۔ ابوداؤد شریف، نسائی، شرح معانی الآثار۔ تقریر دلپذیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و آب حیات بحیث۔ دستور انگلستان، اردو کشف الغمہ عن جمیع الامہ للشعرانی مطالعہ، مطالعہ مشق مناظرہ باجملہ فرق و تحریرات عربیہ۔	تفسیر ۹، حدیث ۱۸، حکم شریعت ۲، گھنٹہ، اصول سیاست ۲، دستکاری ۲ گھنٹہ، دارالمطالعہ آدھا گھنٹہ، تقریر آدھا گھنٹہ	ا۔ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے ملتی ہے۔ ۲۔ یہ کتاب شرف الدین بھنڈی بازار بمبئی ۹ سے ملتی ہے۔

یہ نصاب تعلیم مندرجہ ذیل پتے سے مل سکتا ہے

ا۔ مینیجر مدنی پریس۔ ہواپاڑہ سلہٹ

۲۔ مہتمم مدرسہ درگاہ شریف۔ سلہٹ

۳۔ امدادیہ لائبریری چوک بازار، ڈھاکہ

تعلیم و تربیت

مولانا محمد خاں شیرانی ☆

مدارس کی علماء سے چند کھری باتیں

ہم علماء کرام کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان سے کوئی بات کہنی ہو تو بصد احترام بطور تجویز ان کے سامنے رکھتے ہیں کہ اگر وہ اسے اچھا اور مفید سمجھیں تو اس پر غور فرما لیں لیکن خود علماء کرام میں سے کوئی اگر کچھ کہنا چاہے تو ظاہر ہے یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔

درج ذیل اقتباسات مولانا محمد خاں شیرانی کی ایک تقریر سے لیے گئے ہیں جو انہوں نے جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا فضل الرحمن صاحب کی صدارت میں 'شاندار ماضی کی بازیافت اور اہل مدارس کی ذمہ داریاں' کے عنوان سے کی اور جمعیت کے جریدے الجمعیۃ، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ اس تقریر میں مولانا کا لہجہ تیز اور تلخ ہے اگرچہ باتیں فی الاصل غلط نہیں۔ اس مضمون میں عناوین البتہ ہمارے ہیں۔ مدیر

کیا موجودہ مدارس اسلاف کے طریقے پر ہیں؟

دو چیزیں ہیں: ایک ہے تولید اور دوسری ہے تخلیق ۔دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ پیٹ پالنا، نفس کی تسکین کرنا، اولاد پیدا کرنا، ذات کے لیے سہولت فراہم کرنا، یہ صفت ہے حیوانات کی جب کہ تخلیقات اور ایجادات کرنا الٰہی عمل ہے۔لیکن کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا شخص اس مجمع میں موجود ہے جو کوئی بھی نئی تخلیق کرسکتا ہو جو کہ ایک الٰہی صفت ہے؟ ہم تو وہ لوگ ہیں کہ سوائے حیوانی صفات کے کوئی الٰہی صفت ہم میں موجود ہی نہیں۔

لہٰذا اگر ہم میں صفات حیوانوں کی ہوں اور تقاضا الٰہی خلافت کا کریں تو پھر آپ بتائیں کہ یہ ممکن ہوگا؟ انسانوں کو جہاں روحانی تعمیر و تزکیہ کی ضرورت ہے وہیں پر جسمانی غذا اور سہولتوں کی بھی ضرورت ہے۔ اللہ جل جلالہ نے انسانوں کو خلافت دی ہے تخلیق اور تولید کی بنیاد پر۔ تولید حیوانوں میں بھی ہے اور انسانوں میں بھی لیکن تخلیق الٰہی صفت ہے جو حیوانوں میں نہیں اور جب انسان تولید اور تخلیق کا مجموعہ ہوگا تب جا کر وہ انسانیت کا حاکم بنے گا۔

غرض ہمارے مدارس سے فنی علوم اور فنی تجربے کا عمل نکل گیا ہے، لہٰذا ہم صرف نظری اور تصوراتی حد تک ان فنون سے متعلق رہے اور اپنے فن کو عملی جامہ پہنا کر انسانوں کی مادی زندگی میں نئی تحقیقات کا جو عمل جاری تھا، وہ ہمارے مدارس سے اُٹھ گیا۔

☆ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد و صدر جمعیت علماء اسلام بلوچستان

علماء اپنے کردار پر نظر ثانی کریں

ہم دشمنوں سے کیا گلہ کریں، ہمارے ساتھ اپنوں نے کیا کیا ہے؟ ہم اپنے کردار پر نظر ثانی کریں، **طائر کم فی عنقکم** یعنی تمہاری بدبختی تمہارے گلے کا طوق ہے، باہر سے آئی ہوئی نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے کردار کا جائزہ لیں اور جیسا کہ اللہ جل جلالہ فرماتے ہیں: **قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی** (اے نبیؐ فرما دیجیے: یہ ہے میرا راستہ، اسی راستے کے ذریعے میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں اور میرے صحابہؓ نے یہ راستہ عقل و بصیرت کے ساتھ اختیار کیا ہے)۔ ہمیں ضرورت ہے کہ اس بصیرت کے عمل پر ہم توجہ دیں تاکہ دین میں بھی بصیرت ہو اور فن میں بھی بصیرت ہو تو آپ دیکھیں گے کہ پھر دنیا بدلتی ہے یا نہیں؟ جب ہم بدلیں گے تو دنیا بدل جائے گی جیسا کہ اللہ جل جلالہ فرماتے ہیں: **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر و اما بانفسھم** (بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک اپنی حالت کو وہ خود بدلنے کا ارادہ اور کوشش نہ کریں) تو اگر صفات ہم میں حیوانوں کی ہوں اور اللہ کی خلافت بھی ملے، کیا یہ ممکن ہے؟ اگر تم نے اللہ کی خلافت لینی ہے تو پھر اللہ کی صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ یہ روحانی دنیا نہیں۔ یہ مادی دنیا ہے اگر آپ مادی دنیا میں غور و فکر کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تو جو لوگ مافوق اور ماتحت کائنات پر غور کریں گے اور اس میں الٰہی طبیعت کے جو اصول اور فارمولے ہیں ان کی دریافت کریں گے اور پھر ان دریافت شدہ فارمولوں پر نئی تحقیقات و ایجادات کریں گے تو پھر نتیجہ نکلے، لیکن جب ہم کائنات کو سمجھتے ہی نہیں، کائنات پر ہم نے غور ہی نہیں کیا تو پھر ہم اس کی حقیقت کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

جب ہم میں نہ علمی بصیرت ہو جو فروض عین میں سے ہے اور نہ ہم میں قوم کی ضرورتوں کی تکمیل کا جذبہ اور صلاحیت ہو جو فروض کفایہ میں سے ہے اور ہم تمام دارومدار جذبات اور فتووں پر رکھیں تو پھر اس سے کامیابی ہوگی یا امت کا بیڑہ غرق ہوگا۔

ہم خلافت الٰہیہ کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں؟

اللہ جل جلالہ وضاحت کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں: **وعداللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔** یعنی جو لوگ میری ہدایات پر مکمل اعتماد کریں اور پھر صرف یہ نہیں کہ زبانی کلامی دعویٰ ہو بلکہ اس کی عملی روش اس کے اندرونی یقین کا ثبوت پیش کرے تو پھر میں ان کو خلیفہ بناؤں گا۔ اب آپ بتائیں کہ کیا ہمارے اداروں میں اس درجے کے ایمان اور عمل صالح رکھنے والے لوگ بنائے جاتے ہیں اور کیا ہم بنانے کی فکر میں بھی ہیں تاکہ ہمارا ایمان اور عمل صالح اللہ کے ہاں قبول ہو اور وہ ہمیں خلافت دے؟ خلافت اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ ہے اور

ہمارا فریضہ ایمان اور عمل صالح ہے لیکن ہم بجائے اپنا فریضہ ادا کرنے کے اللہ کی مخلوق پر ڈنڈا اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے سر پھوڑ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ تم نے بُرا کیا ہے تمہارا خالق میرے ساتھ خلافت کا وعدہ نبھاتا کیوں نہیں؟ آپ بتائیں کہ اگر ہم تمام انسانیت کے سر کٹوا دیں تو کیا ان کی استطاعت میں یہ بات ہے کہ وہ اللہ سے یہ وعدہ پورا کروالیں؟ یہ کوئی طریقہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہوا ہے؟

فتووں کی بجائے خیر خواہی

ہم تو دشمنوں کی بات کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے نصاب تعلیم کو بگاڑا ہے لیکن آپ اپنی حالت تو دیکھیں کہ اب مدارس میں ہمارا جو نصاب ہے اس میں مفتی کے سوا اور کوئی چیز بھی بنتی ہے؟ ہر طرف فتووں کی بھر مار ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اپنے بارے میں بھی تو کوئی فتوی اور فیصلہ صادر کریں کہ ہم کیا ہیں؟ جب ہم فارغ التحصیل ہوجاتے ہیں تو پھر کتاب کی جانب کوئی مڑ کر دیکھتا بھی نہیں، تو کیا فتوے کے لیے بس جذبہ کافی ہے کہ جذبہ اٹھا، فتوی ٹھونک دیا، اللہ اللہ خیر سلا۔ نہ کتاب کی ضرورت ہے، نہ کسی مطالعے کی، نہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ کفر کے فتوے پکوڑے بنانے والے بھی لگاتے ہیں جو سب سے مشکل ترین فتویٰ ہے۔ آپ تانگے والے سے پوچھیں، رکشے والے سے پوچھیں کہ استنجا کرنے کے آداب کیا ہیں؟ وہ کہیں گے ''میں مولوی تو نہیں ہوں''۔ آپ ہمارے مولوی صاحب کے پاس تشریف لے جائیں لیکن جب بات فتوے کی آتی ہے تو اگر قاضی القضاۃ بھی اس کے سامنے آئے گا، تو وہ اس کو بھی کہے گا کہ تم کافر ہو۔ یعنی جو مشکل ترین فتویٰ ہے وہ ہم نے آسان ترین بنا دیا اور جو آسان ترین مسائل ہیں ان کو مشکل ترین بنا دیا۔ یہ کردار ادا کر کے کیا ہم نے امت کی خدمت کی ہے؟

نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: **الدین النصیحۃ، قالوا لمن یارسول اللہ؟ قال للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین ولعامتہ۔** دین نام ہے خیر خواہی کا اور خیر خواہی کیسی؟ اللہ کی خیر خواہی اور جب ہم مخلوق ہیں اور وہ خالق ہے تو اس کی خیر خواہی تعظیم و اطاعت ہے۔ اللہ کی کتاب کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی ہدایات کے مطابق ہماری زندگی کی روش ہو۔ آئمۃ المسلمین کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کو راہ راست پر لانے کی جدوجہد کی جائے اور امت مسلمہ کے ہر فرد کی خیر خواہی آپ بتائیں اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ خیر خواہی نام کی کوئی چیز ہمارے دل اور سینے کے اندر ہے؟ کسی کے ساتھ بھی؟

علماء اپنا محاسبہ کریں

ہمیں اپنے دلوں کا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا ہم میں دوسروں کی خیر خواہی کی خاصیت اور صفت موجود ہے؟ اگر ہے تو شکر کا مقام ہے اور اگر نہیں ہے تو پھر فکر کا مقام ہے۔ اگر آپ نے معلوم کرنا ہو کہ میرا یہ عمل،

یہ منصوبہ یا میرا یہ قول بھلائی ہے یا برائی؟ تو اس کے لیے بھی نبی کریم ﷺ نے خود ایک پیمانہ بیان فرما دیا ہے، فرمایا **البر حسن الخلق و الاثم ما حاک فی نفسک و کرھت ان یطلع الناس علیه** بھلائی اچھا اخلاق ہے اور برائی ہر اس عمل کو کہتے ہیں جو آپ کے دل میں کھٹکتا ہو اور آپ نہیں چاہتے کہ میری اس نیت، میرے اس قول اور عمل سے کسی کو آگاہی ہو جائے۔

اب ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گریبانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں کہ کیا ہمارے بہت سارے منصوبے یا خیالات و افکار یا اقوال و اعمال ایسے تو نہیں ہیں کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری نیت سے، اس منصوبے اور اس قول و فعل سے کوئی واقف ہو جائے؟ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ’فتنہ سب سے پہلے انسان کے دل پہ واقع ہوتا ہے، بعض دل اس فتنے کو قبول کر لیتے ہیں اور فتنہ اس دل میں جذب ہو جاتا ہے اور بعض دل اس فتنے کو مسترد کر دیتے ہیں اور فتنہ اس پر سے پھسل جاتا ہے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا کہ ’اگر تم اپنے بارے میں معلوم کرنا چاہو کہ میرے دل میں فتنہ جذب ہوا ہے یا اس کے اوپر سے پھسل گیا ہے تو تم دیکھو کہ جو کام پہلے تمہاری نظر میں بُرا تھا مگر اس وقت وہ آپ کو برا نہیں لگتا یا کوئی کام پہلے زمانے میں آپ بھلائی کا عمل سمجھتے تھے لیکن اب آپ کے ہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی تو سمجھ جاؤ کہ فتنہ تمہارے دل میں جذب ہوا ہے‘‘۔

اب آپ حضرات میں سے ہر ایک اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھے کہ اس کی حالت کیا ہے؟ کیا فتنے ہمارے دلوں میں جذب ہو گئے ہیں یا اس پر سے پھسل گئے ہیں؟

علمی کم مائیگی

جہاں ہم تعلیم کے میدان میں پسماندگی کی جانب جا رہے ہیں وہاں ہم علمی میدان میں بھی کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے۔ آپ حضرات کو معلوم ہے اصول فقہ کے علماء کہتے ہیں کہ ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی کام انسان سے سرزد ہو جائے تو اس کا شریعت میں حکم کیا ہے؟ یہ اگر لوگوں کو معلوم نہ ہو نص میں موجود نہ ہو تو اس حکم کی تلاش کے لیے صلاحیت رکھنے والے علماء قرآن، حدیث، اجماع امت اور مجتہدین کے اجتہادات میں اس عمل کا حکم تلاش کرتے ہیں۔ تلاش کے اس عمل کو استقراء کہتے ہیں، اس استقراء کے نتیجے میں ان کے دل و دماغ پر ایک حکم وارد ہو جاتا ہے، اس عمل کو کہتے ہیں استنباط۔ اور پھر وہ اس عمل اور اس حکم کے درمیان ایک رابطہ جوڑتے ہیں اس کو قیاس کہتے ہیں۔ گویا استقراء، استنباط اور قیاس ان سب کا جو مجموعہ ہے اس عمل کو اجتہاد کہتے ہیں۔

آپ حضرات سے میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایک مجتہد کا اجتہاد دوسرے مجتہد کے اجتہاد کا راستہ روک

سکتا ہے کہ وہ کہے کہ میں جب مجتہد ہوں، مجھے اللہ نے صلاحیت دی ہے تو تمہیں کیا ضرورت ہے اجتہاد کرنے کی؟ آرام سے بیٹھ جاؤ جو حکم میں نے مستنبط کیا ہے اسی پر عمل کرو، کیا یہ حق کسی کو حاصل ہے؟

دوسرا جو عمل ہے وہ یہ کہ شریعت کا حکم اگر بالکل واضح ہو لیکن اس حکم پر عمل کا راستہ مبہم ہو جائے مثلاً نماز میں قبلہ رخ کھڑا ہونا فرض ہے اور شبہ سے بالاتر ہے لیکن اگر دس پندرہ آدمی کسی ایسی جگہ پھنس جائیں کہ قبلہ کے رُخ کا کچھ پتہ نہ چل سکے۔ اب قبلہ کا پتہ چلانے کا جو عمل ہے اس کو'تحری' کہتے ہیں کہ غور کر کے معلوم کیا جائے کہ قبلہ کس طرف ہوگا اور ایک متحری کی تحری دوسرے متحری کی تحری کا راستہ نہیں روک سکتی، یعنی ان پندرہ آدمیوں میں سے اگر کوئی دوسروں کو کہے کہ تم آرام سے بیٹھو میں جب معلوم کروں گا تو اسی جانب نماز پڑھو، تم کوئی تحری نہ کرو یا تمہاری تحری (غور و فکر) کا کوئی اعتبار نہیں تو اس کا کوئی حق اسے ہے؟

فتوے بازی نقصان دہ ہے

تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ فتوے کس چیز کے لگتے ہیں؟ یہ جو ہم فتوے لگاتے ہیں اور امت کا بیڑہ غرق کر رہے ہیں۔ آپ غور کیجیے یعنی ایک عالم جو بہت بڑا آدمی بنے گا تو زیادہ سے زیادہ مجتہد بنے گا، نبی تو نہیں بن سکتا کہ اس کے قول پر عمل کرنا تمام انسانیت کے لیے فرض ہو، تو جب وہ مجتہد ہوگا اور تمام فقہاء لکھتے ہیں کہ مجتہد کے لیے اپنے اجتہاد پر عمل واجب ہے، تحمیل اس کا حق نہیں۔

تو آج اگر یہ علماء اپنے علم پر خود عمل کریں لیکن اپنے علم کو دوسروں پر تحمیل نہ کریں تو کیا ان فتوؤں کی نوبت آئے گی؟ اور جو حضرات چھوٹی چھوٹی باتوں پر فتوے لگاتے ہیں یہ پہلے اپنی وضاحت بھی تو کریں کہ کہیں خارجی تو نہیں ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے ہی خارج ہو جاتا ہے۔ کہیں آپ معتزلی تو نہیں کہ جو کبیرہ گناہ سے انسان کو ایمان سے خارج اور کفر میں داخل سمجھتے ہیں؟ کہیں آپ اہل ظاہر تو نہیں ہیں کہ اعمال کو جزو ایمان سمجھتے ہیں؟

یہ جو آپ تاثر دیتے ہیں کہ ہم مسئلے میں بھی حنفی اور عقیدے میں بھی حنفی ہیں لیکن آپ کا فتویٰ تو حنفی کا فتوی نہیں یا تو پھر اپنے عقیدے کی وضاحت کریں، بعد میں کوئی مانے یا نہ مانے۔ کیونکہ بعض علماء ایسے بھی ہیں کہ مسئلے میں ایک مسلک کے تابع ہیں، عقیدے میں دوسرے مسلک کے۔ امام زمخشری علیہ الرحمۃ کے بارے میں علماء لکھتے ہیں اور انہوں نے خود کتابیں لکھی ہیں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے موازنے پر۔ تو مسئلے میں وہ حنفی ہیں لیکن عقیدے میں معتزلی ہیں۔ قاضی عبدالجبار مسئلے میں تو شافعی ہیں لیکن عقیدے میں معتزلہ کے امام ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ جب بھی اسلام کا زوال ہوا ہے تو وہ اس لیے کہ علماء نے فتوے شروع کیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بغداد میں اہل حدیث کہلانے والے حنابلہ

اور شوافع کے درمیان خون ریزی ہوئی۔ کتنی آبادیاں اجڑ گئیں اور کتنی تباہیاں ہوئیں! لٰہذا ہم دوسروں سے کیا گلہ کریں ہمیں تو اپنے کردار و اعمال پر توجہ دینی چاہیے۔ جب ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے مطابق اور علمی بصیرت کی بنیاد پر اپنی روش کو رکھیں گے تو دنیا ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی؟

جہاد یا فساد؟

آپ جانتے ہیں کہ اگر شرعاً جہاد کا حکم ہو بھی لیکن جو لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں، خواہ وہ کافر ہی ہوں، ان کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص مسلمان بھی ہو اور جنگ میں شریک بھی نہ ہو بلکہ اپنے راستے پر سفر کر رہا ہو، عدالت میں اپنا مقدمہ چلا رہا ہو، دکان میں سودا خرید رہا ہو، ہوٹل میں کھانا کھا رہا ہو، مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو، جنازے کا فرض ادا کر رہا ہو، جرگہ میں فیصلہ کر رہا ہو اور آپ اس کو بم سے اڑا کر اس کے جسم کے پرخچے اڑا دیں تو اس کو کیا کہیں گے؟ کیا یہ بھی جہاد ہے؟ اس کو تو خالص فساد کہنا چاہیے اگر فساد کا نام آپ جہاد رکھیں گے تو پھر جہاد بدنام ہوگا اور مجاہد بدنام ہوگا۔ اور جو لوگ اغواء برائے تاوان کریں، لوگوں کو لوٹیں، گھروں کو لوٹیں، اور آپ ان کا نام طالبان رکھیں تو طالبان بدنام ہوں گے اور جب چھوٹے معصوم بچوں کے معصوم جذبے سے آپ ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کو بم بنائیں گے اور ان کی نسبت مدرسوں کی طرف کریں گے تو پھر والدین مدرسوں میں بچے نہیں بھیجیں گے اور جب مساجد میں بم دھماکے ہوں گے، جمعہ اور عیدین میں بلاسٹ ہوں گے تو پھر کوئی مسجد جانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ جب جنازوں میں بم بلاسٹ ہوں گے تو جنازے کا فریضہ ادا کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ اور جب جرگوں میں بم بلاسٹ ہوں گے تو پھر لوگوں میں مصالحت کرانے کے لیے کسی کا جی نہیں چاہے گا تو جب جہاد بدنام ہوگا، مجاہد بدنام ہوگا، طالب بدنام ہوگا، مسجد کی چاہت امت کے دلوں سے ختم ہو جائے گی، جنازے کے فریضے کی ادائیگی کی طلب ختم ہو جائے گی، مصالحت کا عمل رک جائے گا، والدین مدارس میں بچے بھیجنا بند کر دیں گے اور جب علماء ایجنسیوں کے قتل کے خوف سے خاموش رہیں گے تو پھر آپ بتائیں کہ قوم کا اعتماد ان پر رہے گا؟

میں اکثر دوستوں سے کہتا ہوں کہ بین الاقوامی سیاست آپ جانتے ہو یا نہیں جانتے لیکن اتنی بات تو آپ جانتے ہوں گے کہ کسی محلے یا کسی بستی میں اگر کسی گھر کے اندر لڑائی نہ ہو اور پرامن طریقے سے چھوٹے، بڑے، بوڑھے، جوان، مرد و عورت صلح و آشتی اور مشاورت سے رہیں تو اس گھر کے اندر بغیر اجازت کے کوئی داخل نہیں ہو سکتا...... لیکن جب اس گھر میں لڑائی ہوگی، آہ و فغاں ہوگا، نعرے لگیں گے کہ خدا کے لیے ہمیں بچاؤ، تو پھر محلے والے کسی سے اجازت لیں گے یا دیواریں پھلانگ کر اس گھر کے

اندر داخل ہوں گے؟ دروازوں کو دیواروں سمیت اکھاڑ کر اندر داخل ہوں گے تو یہ جنگ جو ہمارے ملک میں ہے، یہ تیسری دنیا میں مغرب کے اہداف پورا کرنے کے لیے ہے۔

ہمارا دینی تناظر		اکبر ثاقب

اتحاد بین المسالک

اہل سنت بریلوی علماء کا موقف

دوسرے مسالک کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، اس کے بارے میں مولانا مفتی محمد صدیق ہزاروی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

'اہل سنت (بریلوی) کا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، انبیاء کرام ورسل عظام، صحابہ کرام، اہل بیت اطہار، صلحاء امت، قرآن مجید، سنت رسولؐ اور دیگر شعائر اسلام کی توہین قابل برداشت نہیں، توہین کرنے والا کوئی بھی ہو۔ اس کے علاوہ فرعی مسائل کے حوالے سے ہر مکتب فکر اپنے موقف پر عمل کر سکتا ہے۔ نہ تو دوسروں کو اپنے موقف پر جبراً لانے کی کوشش کی جائے اور نہ اپنی تعبیرات کے ذریعے دوسروں کے خلاف کفر وشرک اور بدعت کا فتویٰ لگایا جائے۔ ہر مکتب فکر اپنے معمولات پر عمل کرنے میں آزاد ہے لیکن دوسروں مسلک والوں کی دل آزاری نہیں ہونی چاہیے'۔

امت کے مابین اتحاد و یکجہتی کے حوالے سے مولانا مفتی محمد صدیق ہزاروی نے ہمارے سوال کے جواب میں یوں تحریر فرمایا:

'یہ بات واضح ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن اگر مقررین، واعظین اور ذاکرین ایسے طبقات جن کی تقاریر اور خطبات تجارتی بنیادوں پر ہوتی ہیں، کو کنٹرول کیا جائے، حکومت کسی مکتب فکر سے بلیک میل ہو کر اس سے امتیازی سلوک نہ کرے اور جید علماء اپنے ماتحت لوگوں کی اصلاح کریں تو اتحاد کی فضا ہموار ہو سکتی ہے۔

اگر دیوبندی مسلک کے احباب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کی ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' اور اہل حدیث حضرت مولانا وحید الزمان کی ''ہدیۃ المھدی'' پر عمل پیرا ہوں تو بے شمار مسائل متفق علیہ ہو جائیں۔ اہل تشیع رسول اکرمؐ کے صحابہ کرام کو اسی نسبتِ رسول سے دیکھیں جس نسبت سے اہل بیت اطہار کو دیکھتے ہیں تو یہ عمل بھی

اتحاد کے لیے نہایت ضروری ہے'۔

اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے علامہ مفتی غلام مصطفی رضوی نے فرمایا:

'اتحاد بین المسلمین کو میں وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیتا ہوں۔ یقیناً ہمارا ملک جو انتہائی قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے مسلمان آگ اور خون کے سمندر سے گزرے ہیں، اس کے لیے اتحاد ایک بنیادی چیز ہے اور جب تک مسلمانوں کے تمام طبقات میں اتحاد نہیں ہوگا اس وقت تک نہ پاکستان کی سالمیت برقرار رہ سکتی ہے اور نہ وہ دین باقی رہ سکتا ہے جسے لے کر ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے اختلافات کی وجہ سے اس کا تقدس مجروح ہو رہا ہے۔ ہر شخص کا اپنا نظریہ ہے اور ہر شخص کو آزادیٔ فکر حاصل ہونی چاہیے اور وہ جن عقائد و نظریات کو اپنانا چاہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم جس دین کے پیروکار ہیں اُس کا حکم ہے کہ تمام ملت اسلامیہ متحد ہو جائے اور متحد ہو کر دینِ متین کی خدمت کرے۔ ہمارے اختلافات میں بعض بنیادی باتیں بھی ہیں لیکن زیادہ تر فروعی مسائل ہیں۔ ہمیں ان فروعی اختلافات سے صرف نظر کرنا چاہیے۔ اسلام ہر شخص کو اپنے نظریات وعقائد کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے۔ اب میں اپنی آزادیٔ فکر کے مطابق زندگی گزارنے کا حق تو رکھتا ہوں لیکن مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ میں دوسروں کے نظریات پر تنقید کروں۔ اگر ہم تمام مکاتب فکر اپنے اپنے عقائد و نظریات پر کاربند رہنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے عقائد و نظریات پر تنقید نہ کریں بلکہ احترام کریں تو دین کا یہی تقاضا ہے۔ انسانی رشتوں کے ناتے سے ہماری ذمہ داری بقول علامہ اقبال یہ ہے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

یعنی آدمی کا احترام بھی اپنے مقام پر ہے۔ مابہ الاشتراک ہمارے پاس بہت سی چیزیں ہیں ہم ان پر مل کر کام کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اتحاد ایک بنیادی معاملہ ہے اور اس کے لیے بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہم اپنے عقائد و نظریات پر رہتے ہوئے دوسروں کے عقائد و نظریات کو تنقید کا نشانہ نہ بنائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمارا اتحاد برقرار رہے گا، پاکستان بھی ترقی کرے گا اور اسلام کو بھی فروغ حاصل ہوگا'۔

علامہ مفتی غلام مصطفی رضوی نے تمام مسالک کے مابین باہم احترام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا:

'ہمارے جتنے دینی مدارس ہیں چاہے وہ کسی بھی مکتب فکر کے ہوں، اُن سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو قرآن وسنت اور اپنے دینی مدارس میں چلنے والے نصاب کے مطابق محدود رکھیں اور ایک دوسرے کا احترام کریں۔ یہ نہیں ہے کہ میں کہوں کہ یہ فلاں مکتب فکر کا ہے اور اسے نیچا دکھانے کے لیے اپنے دلائل تھونپنے کی کوشش کروں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنے علاوہ دوسروں کے نصاب تعلیم کا بھی احترام ہونا چاہیے اور نظریات وعقائد کا بھی احترام ہونا چاہیے'۔

اہل حدیث علماء کا موقف

مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی نے اس حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

صورت یہ ہے کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، اگر آپ ایک جج کے پاس لے جائیں تو وہ ایک فیصلہ دیتا ہے اور دوسرے جج کے پاس لے جائیں تو ممکن ہے وہی فیصلہ دے دے یا اس سے کچھ مختلف فیصلہ دے دے لیکن اس سے کوئی فساد پیدا نہیں ہوتا۔
اسی طرح جب کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ درپیش مسئلے میں کسی عالم کی طرف رجوع کرتا ہے تو کوئی فساد پیدا نہیں ہوتا لیکن فساد اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اس سلسلے میں علمی میدان کے اندر مختلف فقہا کو لے کر آئے۔ جب وہ مختلف فقہا کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر جو شخص وجہ کو دیکھتا ہے اُسے اس اختلاف کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے، وہ جان لیتا ہے کہ ایک نے یہ رائے اختیار کی تو اس کی وجہ یہ تھی اور دوسرے نے یہ رائے اختیار کی تو اس کی وجہ یہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول ہے کہ کسی کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ اُس کو اگر میری وجہ علم کا علم نہ ہو تو وہ میرے قول سے فتویٰ دے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

'لا یجوز لاحد ان یفتی بکلامی حتی یعرف دلیلی'

کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ میری گفتگو سے کوئی فتویٰ دے جب تک اُسے میری دلیل کا علم نہ ہو۔ اس سے وہ یہی بتانا چاہتے ہیں کہ جب وجہ معلوم ہو جاتی ہے تو پھر آئمہ کا اختلاف اصولی اختلاف نہیں رہ جاتا۔ وہ اصل میں یوں ہو جاتا ہے کہ ایک چیز کے کئی پہلو ہیں۔ ایک مسئلہ ایک وقت پیش ہوا تو اس وقت یہ پہلو ملحوظ رکھا گیا، دوسری دفعہ پیش ہوا تو اس وقت کوئی دوسرا پہلو ملحوظ رکھا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا اگر یہ انداز ہوگا تو پھر اتحاد قائم ہوگا۔ اس میں اگر کوئی فقہی اختلاف ہو تو اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو عدالتوں کے فیصلوں کی ہوتی ہے۔ اس سے کوئی فساد پیدا نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب علمی اختلاف ہوتا ہے تو پھر اس میں شدت نہیں رہ جاتی۔
بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جو کسی کی عقل اور علم سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر نور و بشر کا مسئلہ ہے۔ یہ اصل میں ہماری عقل سے بالاتر مسئلہ ہے لیکن اسے عوام میں الجھا دیا گیا۔ جب اس کلامی مسئلے کو عوام میں الجھا دیا گیا تو ایک انتہا میں ایک گروہ اِدھر اور ایک انتہا میں ایک گروہ اُدھر کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ آپ گہرا غور کیجیے تو دونوں باتیں درست ہیں۔ نبی کریمؐ آدم کی اولاد میں سے ہیں، عبداللہ کے بیٹے ہیں اور آمنہ کے لال ہیں، ہیں تو انسان ہی لیکن نبی اکرمؐ جس طرح روشنی پھیلا رہے ہیں اس لحاظ سے سرچشمۂ نور ہیں۔ یہ صرف تعبیر کا فرق ہے لیکن عوام تو یہ بات نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ایک اور مسئلہ ہے۔ نبی اکرمؐ کا ایک ارشاد ہے کہ سب سے پہلے مجھے نبوت دی گئی حالانکہ اس وقت ابھی آدم کی تخلیق مکمل نہیں ہوئی تھی۔ الفاظ یہ ہیں:

'کنت نبیّا و آدم بین الجسد و الروح' (سنن ترمذی، مسند احمد بن حنبل، مستدرک حاکم وغیرہ)

یعنی آدم کے جسم میں ابھی روح داخل نہیں ہوئی تھی کہ میں اس وقت بھی نبی تھا۔
یہ حدیث صحیح ہے۔ اب دیکھیے اس کا کیا مفہوم ہے یعنی نبی اکرمؐ ابھی پیدا نہیں ہوئے جب کہ آپؐ ایک طرف آدم کی اولاد میں سے ہیں لیکن نبوت آپؐ کو پہلے مل گئی۔ یہ ایسے ہے جیسے آدم کی اولاد میں سے کسی کی نبوت کا ڈیکلیریشن ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پوری انسانیت کو ایک سمت دینا تھی۔ اس لیے جتنے نبی آتے رہے اُن سے نبی کریمؐ کی نبوت کا اقرار کروایا جاتا رہا اور یہ بات قرآن میں موجود ہے۔ ہوا یہ کہ عوام کو باریک مسائل میں الجھا دیا گیا اور اس بنا پر عوام فتنے کا شکار ہو گئے اور یہ سارا کام ۱۸۵۶ء کے بعد ہوا ہے۔ اس سے پہلے یہ فتنہ تھا ہی نہیں۔ شاہ ولی اللہؒ سے پہلے سنی سنی تھے، شیعہ شیعہ تھے۔ صرف ایک خلافت کا مسئلہ اختلافی تھا۔ اس کی بنا پر دو مکتب فکر تھے لیکن فقہی اختلاف بہت کم تھا مثلاً جتنے اثنا عشری فقہِ شافعی کے قریب ہیں اُتنے حنفی فقہِ شافعی کے قریب نہیں۔ فقہی اختلاف تو آپس میں ہے ہی بہت کم۔ اس لیے یہ فتنہ سارا اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم عوام کو اس فتنے میں الجھا دیتے ہیں۔ یہ فرقہ بندی ضد سے پیدا ہوتی ہے۔ علماء کی باتیں ہوتی ہیں، وہ عوام کو تقسیم کر دیتے ہیں'۔

انھوں نے عبادات و معاملات کو الگ الگ کرتے ہوئے دونوں شعبوں میں قربت اور ہم آہنگی کا جائزہ لیا۔ انھوں نے مزید کہا:

'اہل حدیث، دیو بندی، بریلوی اور شیعہ کے اختلافات دراصل تین چیزوں میں ہیں۔ عبادات میں، وہ بھی کچھ جزوی اختلافات ہیں۔ سب کے نزدیک نماز میں پہلے قیام، پھر رکوع، پھر قومہ اور سجدہ ہے۔ تمام کے نزدیک پانچ نمازیں ہیں۔ تھوڑا بہت اختلاف ہے مثلاً شیعہ کہتے ہیں کہ بغیر عذر کے ظہر اور عصر کو ملا کر پڑھ سکتے ہیں جبکہ اہل حدیث کہتے ہیں کہ عذر کی صورت میں ملا کر پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح کے معمولی معمولی اختلافات ہیں۔

ہم نے ان اختلافات کو اہمیت دی ہوئی ہے حالانکہ تعمیر مملکت یا تعمیر ملت کے اندر ہمارے اجتماعی معاملات آتے ہیں۔ ہمارے اجتماعی امور یعنی ہماری معاشرت، ہماری معیشت، سیاست اور قانون۔ یہ امور نظام اسلامی سے متعلق ہیں تو پھر ہم نظام اسلامی میں اکٹھے کیوں نہیں ہوجاتے جب کہ یہاں کوئی بھی فقہی اختلاف نہیں ہے۔ اس پر پہلے اکٹھے ہوں۔ جب اس پر اکٹھے ہوگئے تو اس کے اثرات باقی چیزوں پر بھی پڑیں گے۔

میرے اندر ایک جذبہ ہے کہ کاش ہم زبان سے اتحاد ملت کی بات کرنے کی بجائے اس کا عملی مظاہر کریں اور میں خود ایسا ہی کر رہا ہوں۔ تمام مکاتب فکر کی نمائندگی پر مشتمل ادارے بنانے میں میرا نمایاں کردار ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں گروہ بندی بہت خطرناک ہے اس لیے ہم تو تمام مکاتب فکر کے پیچھے خود نماز پڑھتے ہیں اور جب وہ یہاں ہمارے ہاں آتے ہیں تو اُن کو امام بناتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سہیل حسن نے اپنے انفرادی تجربات اور اپنے والد گرامی قدر مولانا عبدالغفار حسن مرحوم کے واقعات حیات کے حوالے سے اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال فرمایا۔ انھوں نے انتہائی سوز دل کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

اسلامی مسالک کے مابین اصل اختلاف تاویل وتفسیر کا ہے۔ ہم نے قرآن وحدیث سے ایک طرح سے حکم لیا ہے، ہم اس پر عمل کر رہے ہیں۔ دوسرے نے دوسری طرح سے لیا اور وہ اس پر عمل کر رہے ہیں۔ اس میں جتنی ہم آہنگی ہوسکتی ہے وہ اچھی ہے اور جہاں نہیں ہوسکتی وہاں اپنے اپنے نقطۂ نظر پر عمل کریں۔ اختلاف میں کوئی حرج نہیں لیکن تناؤ، قتل وغارت اور تشدد کی کیفیت نہیں ہونی چاہیے۔

میں کراچی میں بھی رہا ہوں اور ۲۵ برس سے اسلام آباد میں ہوں۔ باہمی اختلافات کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ نہ شیعہ سنی کا کوئی مسئلہ تھا، نہ حنفی دیوبندی اور بریلوی کا تھا۔ سب مل جل کر رہتے تھے۔ کراچی میں شیعہ فیملی بھی ہمارے دوستوں میں سے تھی۔ آنا جانا، لین دین چلتا رہتا تھا۔ ایسے واقعات تھے کہ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا یہ کچھ اور ہیں۔ ہم آپس میں بھائی بہن کی طرح تھے۔ ہمارے بچے اکٹھے کھیلتے تھے۔ خواتین کو خالہ، ممانی کہتے تھے۔ بڑی محبت سے رہتے سہتے تھے۔ ان کی بچیاں بھی ہمارے گھر میں آتی تھیں۔ تہواروں کے موقع پر ایک دوسرے کو کھانا بھیجتے تھے۔ بعد میں معاشرے میں غلط چیزیں پیدا ہوگئیں۔ یہ امن اور آشتی کا معاشرہ تھا۔ اس کو ایسا بگاڑ دیا گیا کہ اب گویا ہم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ بھی نہیں سکتے، ایک دوسرے کے ساتھ بات بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟

اتحاد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کا فورم ایک اچھا، بڑا اور بہترین فورم ہے۔ اس میں سب کو مناسب نمائندگی دی جانا چاہیے۔

میرے والد اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر تھے۔ علامہ طالب جوہری بھی ممبر تھے۔ ایک مرتبہ میرے والد صاحب نے کہا کہ ایک رپورٹ ہے اس کے سلسلے میں طالب جوہری صاحب سے ملنا ہے۔ میں انھیں لے گیا۔ وہ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ اس موضوع پر ڈسکشن ہوئی۔ طالب جوہری صاحب کہنے لگے کہ میں سگریٹ پینے کا عادی ہوں لیکن مولانا کے احترام میں نہیں پی رہا۔ یہ ایک دوسرے کے احترام کی روایت تھی۔ والد صاحب کا خود جانا اور ان کا والد صاحب کے احترام میں سگریٹ نہ پینا، یہ باہمی احترام کی علامت تھی۔

تمام مکاتب فکر کا آپس میں ایسا ہی تعلق قائم تھا۔ بریلوی، دیوبندی، شیعہ، اہل حدیث سب کا باہمی احترام کا تعلق تھا۔ میرے والد صاحب فیصل آباد میں بھی رہے۔ وہاں بھی ان کا سب سے تعلق تھا۔ انہیں اس سلسلے میں طعنے بھی سننے پڑتے تھے لیکن انہوں نے اس مشن کو نہیں چھوڑا۔ ان بزرگوں کے طرز عمل پر چلیں تو قربتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ مختلف چیزوں پر آپس میں ہم بات چیت کر سکتے ہیں'۔

حافظ ابتسام الٰہی ظہیر نے اس موضوع پر خاصی کھل کر بات کی اور اپنی گفتگو کے دوران میں جو

مسائل روزمرہ اختلافات کا باعث بنتے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کیا اور اس سلسلے میں مفید حکمت عملی بھی تجویز کی۔ وہ کہتے ہیں:

’میں سمجھتا ہوں کہ امت کے اتحاد کے لیے سب سے پہلے اور اہم ترین بات یہ ہے کہ کسی بھی مکتب فکر کے سڑک چھاپ علماء کی رائے کو نظر انداز کر دیا جائے اور دوسری بات یہ ہے کہ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اگر کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جس سے اُس کے مسلک میں کوئی پیش رفت معلوم ہوتی ہے تو اُس پر اعتماد کیا جائے، بدگمانی کا مظاہرہ نہ کیا جائے اور نہ ہی تجسس کا عمل آگے بڑھایا جائے ”وَّلَا تَجَسَّسُوا“ (۴۷) کے تحت میں سمجھتا ہوں کہ تجسس درست نہیں اور نہ ہی اس کو کسی مصلحت یا مداہنت کے کھاتے میں ڈال کر اسے رد کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بہت مثبت رائے سامنے آتی ہے لیکن اس رائے کو اس لیے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اُسے مصلحت یا مداہنت کا نام دے دیا جاتا ہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کچھ کتمان کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجموعی اعتبار سے اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ ماضی قریب میں، میں نے جناب محمد حسین اکبر (ایک شیعہ عالم دین) کے ساتھ ایک سیمینار میں شرکت کی تھی، اس میں انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ بسم اللہ کی باء سے لے کر والناس کی سین تک ہم قرآن کو محفوظ و مامون اور غیر متبدل مانتے ہیں۔ میں نے اسی وقت یہ بات کہی تھی کہ ہم مولانا کی اس بات کا احترام بھی کریں گے اور اُن پر اعتماد بھی کریں گے۔ انھوں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ شیعہ کتب میں کچھ روایات ایسی ہیں جو اس رائے کے خلاف جاتی ہیں لیکن ہم ان روایات سے احتجاج نہیں کر رہے یا استنباط نہیں کر رہے تو اہل سنت بھی ان سے استنباط نہ کریں تو میں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے اور اگر آپ کے ذمہ دار علماء عوامی سطح پر یہ بات کہتے ہیں تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ایسی روایت سے استنباط کریں یا ان سے احتجاج کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس رجحان کو فروغ مل جائے تو اس سے خود بخود اتحاد امت کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اہل سنت کی اہل تشیع سے متعلق بدگمانی ہے کہ اہل تشیع صحابہ کرامؓ سے متعلق منفی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کا بھی اس دن ازالہ کیا۔ حافظ کاظم رضا نقوی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے اس موقعہ پر یہ بھی کہا کہ ازواج النبیؐ امہات المومنین ہیں یعنی مومنین کی مائیں

ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو آل علی تو پہلے ہی مسلمانوں کے لیے یکساں اہمیت اور تقدس کے مقام پر فائز ہیں تو پھر ان شاء اللہ، اللہ کے فضل وکرم سے یہود ونصاریٰ ہی ہمارے مخالف رہ جاتے ہیں پھر امت مسلمہ میں سے کسی کو ایک دوسرے کے لیے آپس میں بغض وکینہ رکھنے کی ضرورت نہیں'۔

ڈاکٹر ابتسام الٰہی ظہیر نے امت مسلمہ میں تفرقے کے خاتمے کے لیے بعض اہم تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے فرمایا:

'امت مسلمہ کے تفرقے کے خاتمے کے لیے چند نکات بیان کرنا چاہوں گا۔ امت مسلمہ میں اختلافات کے خاتمے کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ قرآن فہمی اور حدیث فہمی کو عوامی سطح پر رواج دینا چاہیے۔ قرآن وسنت کا فہم صرف علماء کی مسندوں اور منبروں تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ جس طرح دیگر علوم تک عوام نے رسائی حاصل کی ہے اسی طرح ان کی قرآن وسنت کے علوم وفنون تک رسائی ہونی چاہیے اور ان کو کچھ نہ کچھ اپنی زندگی کا حصہ ان کے مطالعے میں ضرور صرف کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے درمیان اُس قسم کے مکالمے کی بنیاد پڑنی چاہیے جس قسم کے مکالمے کی روش دیگر امور کے اندر مختلف فیلڈز کے سپیشلسٹ لوگوں کے درمیان موجود ہے۔ طب کے ماہرین مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک صحت مند مکالمے پر یقین رکھتے ہیں اور اُن کے آپس میں سیمینار اور فورم بھی ہوتے ہیں لیکن یہ چیز جب ہمارے علماء کی سطح پر آتی ہے تو اکیڈیمک رہنے کی بجائے جذباتی صورت اختیار کر لیتی ہے، اکیڈیمک نہیں رہتی، بسا اوقات معنی کی بجائے لفظوں کو پکڑنے والی بات بن جاتی ہے اور حروف کو پکڑ کر باتوں کا بتنگڑ بنانے کی روش اختیار کر لی جاتی ہے، یہ بات نہیں ہونی چاہیے مثلاً میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کہتا ہوں اور میرے سامنے بیٹھا ہوا ایک شیعہ ''علیہ السلام'' کہتا ہے اس کا ہمارے مکالمے پر اثر نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی شخص اپنے لب ولہجہ کے اعتبار سے زیادہ شستگی نہیں رکھتا جو دوسرے کی زبان میں ہے تو اس کے لفظوں کی عدم شستگی کو اس کے دماغ کی خرابی پر محمول نہیں کرنا چاہیے یا اس کی بدنیتی پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ جب مکالمہ ہو تو سننے والوں کو دلائل کی روشنی میں مسئلے کو لینا چاہیے۔ صرف ظاہری احترام تک بات نہیں رہنا چاہیے۔ علمی مباحث کو فروغ ملنا

چاہیے۔ سمجھنے سمجھانے اور سیکھنے سکھانے کا عمل آگے بڑھنا چاہیے اور اس طرح مختلف کمیونٹیز میں انتہا پسندی کا خاتمہ ہو سکے گا۔ سیکھنے کے طور پر چھوٹے چھوٹے مسائل بھی زیرِ بحث آنے چاہئیں مثلاً رفع یدین کا مسئلہ زیر بحث ہو یا آمین کا مسئلہ زیر بحث ہو، طلاق ثلاثہ کا مسئلہ زیر بحث ہو اس سے فرق نہیں پڑے گا بلکہ اس سے عوام میں شعور کی ایک سطح بھی بلند ہوگی اور عوام کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ اسے انا کا مسئلہ بنانے کی ضرورت نہیں اور ایک صحت مندانہ گفتگو جس طرح میڈیسن میں ہو سکتی ہے، انجینئرنگ میں ہو سکتی ہے، سوشل سائنسز میں ہو سکتی ہے مذہب میں بھی اسے جاری رہنا چاہیے'۔

(ثاقب اکبر صاحب کی کتاب 'پاکستان کے دینی مسالک' سے اقتباسات)

ہمارا دینی تناظر　　پروفیسر ملک محمد حسین ☆

اسلام میں تعلیمِ مسلسل کا شاندار نظام فرقہ واریت کی زد میں

اسلام علم و عمل کا سر چشمہ اور تعلیم و تربیت کا ایک شاندار نظام ہے۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے نیز ایک حدیث مبارکہ کے مطابق مہد سے لحد تک یعنی گود سے گور تک علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ گود سے قبر تک علم حاصل کرنے کا تصور تعلیمِ مسلسل Continuing Education کا ایک ایسا مربوط تصور ہے جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پیش کیا۔ موجودہ دور میں یہ تصور مغرب نے دیا اور اس تصور کے تحت جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں میں تعلیم کے توسیعی مراکز، تعلیمِ مسلسل کے مراکز، تعلیمِ بالغاں کے مراکز اور اسی طرح کے دیگر انتظامات کئے گئے۔ موجودہ دور میں شارٹ کورسز، برجنگ کورسز (Bridging Courses) اور ایڈوانس کورسز کے نام سے بھی تعلیم مسلسل کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ فاصلاتی نظامِ تعلیم، ریڈیو کے تعلیمی توسیعی پروگرامز، ٹیلی ویژن کے تعلیمی پروگرامز، انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے دیگر ذرائع بھی تعلیمِ مسلسل کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

تعلیمِ مسلسل کے ضمن میں جن طریقوں، وسائل اور ذرائع کا اوپر کی سطور میں ذکر کیا گیا ہے اُن سے سب لوگ، معاشرے اور مذاہب کے ماننے والے استفادہ کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اہل اسلام بھی ان طریقوں اور وسائل سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن اللہ رب العزت نے جمعتہ

المبارک کا انسٹی ٹیوشن دے کر مسلمانوں کو تعلیم مسلسل کا جو شاندار نظام دیا ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔اس پر کوئی لاگت نہیں آتی۔اس کے لیے اضافی جگہ اور اضافی اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں۔اس کے لیے الگ موبلائزیشن،دعوت اور بلاوے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔یہ ایک ایسا اہتمام ہے جو خودکار ہے۔سات دنوں میں ایک بار ضرور وقوع پذیر ہوتا ہے۔لوگ بندھے بندھائے اپنی آزاد مرضی سے وقت مقررہ پر جمع ہو جاتے ہیں اور ہمہ تن گوش ہوتے ہیں۔سُننے سمجھنے اور پلے باندھنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔شرط یا ضرورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کو جمعۃ المبارک کے خطبہ میں وہ کچھ دیا جائے جو اُن کی دینی اور معاشرتی ضرورت ہے۔جمعۃ لمبارک کا ہفتہ وار اہتمام دین مبین کی طرف سے تعلیم مسلسل کا وہ شاندار انتظام ہے

☆ ڈائریکٹر الفوز انٹرنیشنل کالج،جوہرآباد(خوشاب)

جو دنیا کے کسی مذہب،نظام اور تعلیمی سسٹم نے اپنے شہریوں کو نہیں دیا۔شرط صرف یہ ہے کہ:!

۱۔ خطیب حضرات قرآن وسنت کی روشنی میں صرف اسلام پیش کریں،اپنے ذاتی خیالات،ذاتی تعصّبات اور اپنی من مانی تشریحات سے اجتناب کریں۔

۲۔ موضوعات ایسے منتخب کریں جن سے لوگوں کو اپنی زندگیاں اسلام کے مطابق،جیسا کہ قرآن وسنت میں بتایا گیا ہے،گزارنے کی راہنمائی اور سہولت ملے۔

۳۔ خطبوں میں دین کا استحضار طرح کریں کہ لوگوں میں دین کی باتیں سُننے کا شوق پیدا ہو۔ان کے اذہان تفہیم دین کے لیے یک سو ہو جائیں۔دینِ اسلام ان کے لیے فخر و انبساط کا باعث بنے۔معاشرے میں یک جہتی،اور محبت کا فروغ ہو اور لوگ جب جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلیں تو ان کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو چکا ہو۔

۴۔ خطبہ مختصر،سادہ،قابل فہم اور حاضرین جمعہ کی ذہنی سطح کے مطابق اور ان کی دینی ضروریات کی عکاسی کرتا ہو۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کے عام طور پر برعکس ہو رہا ہے۔(الا ماشاءاللہ) مساجد فرقوں میں بٹی ہوئی ہیں۔کوئی مسجد اہل حدیث ہے تو کوئی مسجد اہل سنت والجماعت۔کوئی مسجد بریلوی مسلک کی پرچم بردار ہے تو کوئی دیوبندی مسلک کی دعویدار۔کوئی مسجد فقہ جعفریہ کا جھنڈا اتھامے ہوئے ہے تو کوئی فقہ حنفیہ کی پرچارک نظر آتی ہے۔باقی تو سب رہے ایک طرف،فرقہ واریت کی سب سے مخالف جماعت،جماعتِ اسلامی بھی اب اس دوڑ میں شامل ہوتی نظر آتی ہے۔تونسہ شریف اور داجل ضلع راجن پور میں تو راقم خود مشاہدہ کر چکا ہے اور اب وہاڑی سے بھی جماعت اسلامی کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی خبر آ چکی ہے۔مملکت خداداد پاکستان میں مسلمانوں کی بہت کم

مساجد رہ گئی ہیں، زیادہ تر اب فرقہ بازی ہر طرف چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فرقہ بازی پر مبنی ان مساجد اور فرقہ بازی کی تعلیم و تربیت سے مسلح ان مساجد کے خطیب حضرات مسلمانوں کی اسلامی تربیت کی بجائے اپنے مسلک اور اپنے فرقے کے نظریات کا ابلاغ ہی کرتے ہیں۔ شروع میں کچھ آیات ضرور پڑھی جاتی ہیں اور درمیان میں کہیں کہیں قرآن و حدیث کے اقتباسات بھی شاید پیش فرماتے ہیں لیکن مطالب اپنی مرضی کے اخذ کرتے ہیں۔ کئی بار راقم کو خطبہ سنتے ہوئے سخت ذہنی کوفت ہوئی جب خطیب دل پذیر نے انتہائی اونچے سروں میں انتہائی لغو بات کہہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگ اب جمعہ کی دوسری اذان ہونے پر ہی مسجد میں جوق در جوق آتے ہیں اور اپنے آپ کو خطیب حضرات کی بے معنی تقاریر سے محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے چند ایک ایسے خطیب حضرات کے ہاں جمعہ پڑھنے کا تجربہ ہوا جو خالصتاً قرآن کی تعلیم احادیث نبوی کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور نہایت احتیاط اور توازن کے ساتھ اپنے مقتدیوں میں دین کا فہم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ایک روشن مثال پنجاب یونیورسٹی کی جامع مسجد کے سابق خطیب جناب ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی کی ہے جن کا خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہی مسجد بھر جاتی تھی اور لوگ منبر کے قریب جگہ لینے کے لیے جلد سے جلد آنے کی کوشش کرتے تھے۔ اعوان ٹاؤن لاہور کی جامع مسجد میں تھوڑا سا عرصہ ڈاکٹر خالد علوی مرحوم و مغفور خطبہ دیا کرتے تھے اور وہاں بھی نمازی جلد از جلد مسجد میں پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے اولین دور میں میں خوشاب کی ایک مسجد میں جمعہ پڑھا کرتا تھا جہاں مولانا بشیر احمد مرحوم خطبہ دیا کرتے تھے جو خالصتاً قرآن و حدیث پر مبنی اپنا خطبہ تیار کر کے لاتے اور مقتدی حضرات خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہی مسجد بھر دیتے تھے۔ اس طرح کی ملک میں یقیناً سینکڑوں مثالیں ہوں گی لیکن لاکھوں دیگر مثالیں جہاں فرقہ بازوں کا زور ہے اس کے برعکس ہیں۔ اس صورت حال میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی منشا جو جمعۃ المبارک کے ادارے کے ذریعے پوری کرنا مقصود ہے خاکم بدہن ناکام کی جا رہی ہے۔ ملی مجلس شرعی کے بعض سرکردہ علماء جن میں ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید محترم، مولانا محمد خان قادری، محترم مولانا زاہد الراشدی، محترم مولانا فضل رحیم اور دیگر شامل ہیں مشاورتی مجالس میں اس امر پر تشویش کا اظہار کرتے رہے ہیں اور اس بات کی خواہش کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ مسلکی اختلافات اور فرقہ واریت کی حد سے بڑھی ہوئی بیماری کا سد باب ہونا چاہیے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ علماء حق بھی اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ ان کے شاگردان اور مریدان کو جس راہ پر چلایا گیا تھا وہ اب واپس مڑنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اُلٹا اپنے شیوخ کے لیے بھی ایک مصیبت بن گئے ہیں۔ امامت و خطابت اب دینی کام سے زیادہ ایک پیشہ اور نفع بخش کاروبار بن گیا ہے اور وہ تمام الائشیں جو پیشوں اور کاروبار سے منسلک ہوتی ہیں وہ

اس مقدس کام کے ساتھ بھی شامل ہوگئی ہیں۔

نتیجہ اس کا کیا ہے؟

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ فرقہ واریت کا عفریت پھیلتا جا رہا ہے۔ نچلے ذہن کے لوگ اس سے وسیع پیمانے پر متاثر ہو رہے ہیں۔ ذہین لوگ دین سے ہی متنفر ہو رہے ہیں۔ دین کی ترویج اور دینی تعلیم و تربیت کے تسلسل کے لیے اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے جمعتہ المبارک کا جو ادارہ قائم کیا ہے اس کی اثر پذیری اور اس کی افادیت فرقہ واریت کے ہاتھوں کچلی جا رہی ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ اور ناقابل معافی گناہ ہے جن کا ہمارے فرقہ باز خطیب ارتکاب کر رہے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ کو یہ حضرات کیا جواب دیں گے اس پر غور کریں اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی منشا و مرضی کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ قرآن و حدیث پر مبنی صحیح دین لوگوں تک پہنچائیں۔

علاج اس کا کیا ہے!

اس مرض کا علاج صرف تنقید اور تلقین نہیں بلکہ مثبت منصوبہ بندی کے ساتھ ایک مربوط لائحہ عمل دینا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اس کی اصل ذمہ داری تو اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے بشرطیکہ ایسی کوئی حکومت کسی ملک میں قائم ہو۔

خود ہمارے دستور میں شامل قرار دادِ مقاصد اور دستور کا آرٹیکل 31 اس امر کو یقینی بنانے کو کہتا ہے کہ ریاست اس بات کا اہتمام کرے گی جس کے نتیجے میں ریاست کے عوام اپنی زندگی اسلام کے مطابق گزار سکیں جیسا کہ قرآن وسنت میں بتایا گیا ہے۔

دستور کے اس اہتمام کے مطابق حکومت نے تعلیمی نظام کے ذریعے اور تعلیمِ مسلسل کے دیگر ذرائع کے ذریعے یہ انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اس میں تعلیمِ مسلسل کا وہ ربانی نظام یعنی جمعہ کا اجتماع خصوصاً شامل ہے۔ صلوۃ کا قیام اور جمعہ کے نظام کا انضباط اسلامی حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے اسی لیے ہم کہ رہے ہیں کہ خطبہ ہائے جمعہ کے ذریعے عوام کی تعلیم وتربیت کا لائحہ عمل بنانا اور نافذ کرنا اسلامی حکوموت کی ذمہ داری ہے۔ بدقسمتی سے ہم چونکہ اس نعمت سے محروم ہیں لہذا علماءِ کرام کو یہ ذمہ داری اجتماعی طور پر نبھانا ہوگی۔ اس کا راستہ یوں نکلتا ہے کہ پانچوں وفاق جو دینی مدارس کو اپنی اپنی سطح پر مربوط کرتے ہیں، ان کے جید علماءِ کرام مل ~~بیٹھیں اور ہر سال خطبہ ہائے~~ جمعہ کے موضوعات اور ان کا مواد طے کریں۔ اور اپنے اپنے حلقے میں شامل خطباء حضرات کو پابند کریں کہ وہ اپنے خطبے ان کی ہدایت اور تربیت کے مطابق ارشاد فرمائیں۔ ملی مجلس شرعی اس سلسلہ میں کلیدی کردار ادا کرسکتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اگر سیاست اور فرقہ واریت سے پاک کی جاسکے اور اس میں ملک کے نامور علماءِ کرام جو ملت

اسلامیہ میں عزت وقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں ارکان کے طور پر موجود ہوں تو اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس سلسلہ میں مثبت کردار ادا کرسکتی ہے۔ ایک دفعہ اس عظیم تربیتی ادارہ یعنی جمعۃ المبارک کے خطبہ کی اہمیت کا احساس کرلیا گیا اور اسے تعلیم وتربیت اسلامیہ کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی سبیل کر لی گئی تو ان شاء اللہ تبدیلی آئے گی اور اسلام کی ترویج وسربلندی کا راستہ نکلے گا۔

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں
حفیظ جالندھری

پاکستانیات　　ڈاکٹر محمد امین

ہم کرپٹ قوم کیوں ہیں؟

پچھلے کئی سالوں سے پاکستان دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں سرفہرست ہے۔ اس کے صدر سے لے کر وزیر اعظم تک اور ارکان کابینہ سے لے کر ٹاپ بیوروکریٹ تک سب کرپشن میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ نچلی سطح پر بھی برا حال ہے۔ سال گزشتہ کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی دنیا کی چوتھی کرپٹ ترین قوم ہیں۔ دو چھوٹے ممالک کو چھوڑ دیں تو پہلا نمبر دراصل روس کا ہے اور دوسرا پاکستان کا۔ یہ عجیب المیہ ہے کہ اس صدی میں نظریاتی طور پر دو بڑی ریاستیں وجود میں آئیں اور اخلاقی لحاظ سے دونوں ناکام ہوگئیں۔ اگرچہ دونوں کی ناکامی کا بنیادی سبب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ روس کی اخلاقی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ اس کا نظریہ فلاپ ہوگیا اور پاکستانی کی اخلاقی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں معاشرے کے کارفرما عناصر اپنے نظریۂ حیات پر عمل اور اس کی تنفیذ میں ناکام ہوگئے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ حکومت بھی احتساب کے نعرے لگا رہی ہے اور اپوزیشن کے سیاست دان بھی۔ پچھلی کئی دہائیوں سے احتساب کا سلسلہ جاری ہے۔ صدر ایوب کی پہلی فوجی حکومت نے سیاست دانوں کے احتساب کے لیے ایبڈو جیسا قانون بنایا۔ سیاست دانوں نے بھی حسب موقع تھوڑا بہت احتساب کیا، سول ملازمین کا بھی اور اپنے سیاسی مخالفین کا بھی اور نظر یہ آ رہا ہے کہ غالباً اگلے الیکشن میں بھی احتساب کا نعرہ سرفہرست ہوگا؟ اس سب کے باوجود ہماری سطح بینی کی یہ حالت ہے کہ ہم اس پر غور ہی نہیں کرتے کہ اس احتساب کی ضرورت آخر کیوں پیش آتی ہے؟ اس کا جواب نہایت آسان ہے کہ

ہمیں احتساب کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہمارے معاشرے کے کارفرما عناصر (خصوصاً سیاست دان، فوجی اور سول بیوروکریٹ وغیرہ) کرپٹ ہیں لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ہمارے معاشرے کے کارفرما عناصر آخر کرپٹ کیوں ہیں؟

اس سوال پر غور کے کئی پہلو ہوسکتے ہیں مثلاً ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ مادہ پرست ہوگئے ہیں، وہ راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں، وہ دنیا کی حرص اور ہوس میں مبتلا ہوگئے ہیں، انہیں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر نہیں رہی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ جواب صحیح ہے لیکن یہ بات پھر بھی سوچنے کی ہے کہ لوگ حرص وہوس میں کیوں مبتلا ہوگئے ہیں؟ انہیں خدا کا خوف اور آخرت کی فکر کیوں نہیں رہی؟ وہ کیوں ہر طرح کے اصول واقدار کی نفی کر کے دولت مند بننا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ معاشرے کا تعلیم وتربیت کا نظام غلط ہے۔ یہ نظام نہ افراد معاشرہ کو مذہب اور اخلاق کی صحیح تعلیم دیتا ہے اور نہ ہی ان کی صحیح طریقے سے تربیت کرتا ہے۔

اب جب ہم اس نکتے تک آپہنچے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کرپشن کی بڑی وجہ ہمارے نظام تعلیم وتربیت کی خرابی ہے تو آیئے پھر اس پر بھی غور کرلیں کہ ہمارے معاشرے کے نظام تعلیم وتربیت میں کیا خرابی ہے کہ وہ باکردار اور بااخلاق افراد تیار نہیں کرتا؟ ایک سیدھا سادہ فارمولا یہ ہے کہ جو نظام تعلیم وتربیت معاشرے کے نظریات کے مطابق افراد تیار نہیں کرتا ہے وہ ناکام ہے اور جو نظام تعلیم معاشرے کے نظریات کے مطابق افراد تیار کرتا ہے وہ کامیاب ہے، خواہ معاشرہ امریکی ہو یا پاکستانی، چینی ہو یا جاپانی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان کا نظام تعلیم ناکام ہے، کیونکہ وہ معاشرے کے نظریات (جو یقیناً اسلام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں) کے مطابق افراد کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکا۔ پاکستانی نظام تعلیم کی اس ناکامی کا سبب کیا ہے؟ اس ناکامی کے ذمہ دار معاشرے کے وہ کارفرما عناصر ہیں جو ملکی نظام تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کے حوالے سے بات کی جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ پبلک سیکٹر میں یعنی حکومتی سطح پر اس کی ناکامی کی ذمہ داری، ہماری اسٹیبلشمنٹ یعنی قوت حاکمہ پر آتی ہے، جس میں سیاست دان (خواہ وہ جاگیردار ہوں یا سرمایہ دار) اور سول وفوجی بیوروکریسی سرفہرست ہے۔

پاکستانی قوت حاکمہ پہلے دن سے منافقت کا رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ وہ مغربی فکر وتہذیب کی چکاچوند سے مرعوب ہے اور اسے ہی ترقی کا زینہ سمجھتی ہے یا پھر وہ اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کی اسیر ہے اور اس کے لیے 'سٹیٹس کو' ضروری سمجھتی ہے اور کوئی تبدیلی خصوصاً اسلامی تبدیلی اسے کسی قیمت پر گوارا

نہیں۔ اس ذہنی فضا میں ہماری قوت حاکمہ سرے سے اس کی قائل ہی نہیں کہ نظام تعلیم وتربیت کو اسلامی رنگ میں رنگا جائے تاکہ وہ پاکستانی معاشرے کے نظریات کے مطابق ایک یکسو اور مستحکم مسلم شخصیت کو جنم دے سکے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے یہاں تعلیم عام نہیں ہونے دی اور جو تھوڑی بہت ہے اس کا یہ حال ہے کہ یہاں حکومتی ٹاٹ سکولوں کے ساتھ انگریزی میڈیم سکول بھی ہیں۔ یہاں مشنری سکول بھی کام کر رہے ہیں جو غیر مسلم ممالک کے تعلیمی اداروں سے ملحق ہیں اور انہی کا نصاب پڑھاتے ہیں۔ انگریزی زبان نرسری سے پڑھائی جاتی ہے، نصاب جو حکومتی سکولوں میں رائج ہے وہ بھی اسلامی تناظر میں مدوّن نہیں کیا گیا بلکہ اکثر مغربی ممالک کی نصابی کتابوں کا چربہ ہوتا ہے۔ مذہبی تعلیم جو دی جاتی ہے وہ ناکافی بھی ہوتی ہے اور غیر موثر بھی۔ اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کا نظام تو برا بھلا موجود ہے لیکن نظریاتی تربیت کا نہیں اور نہ موزوں ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ماحول کو تربیتی رنگ دیا جاتا ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ژولیدہ فکری کا شکار ہے۔ یہ ایسے افراد تیار کر رہا ہے جو مغربی فکر سے مرعوب ہیں اور اسلامی فکر پہ یکسو نہیں۔ ان حالات میں ایک مستحکم اسلامی شخصیت کیسے پروان چڑھ سکتی ہے؟

پرائیویٹ سیکٹر کا حال اس سے بھی پتلا ہے۔ یہاں تعلیم اسلامی یا رفاہی نقطۂ نظر سے دی ہی نہیں جاتی۔ یہاں نچلے طبقے میں یہ ذریعۂ روزگار ہے اور بعض بڑے ادارے اسے بطور کاروبار اور انڈسٹری چلا رہے ہیں۔ چونکہ یہ کاروبار ہے لہٰذا ان تاجروں کا ہدف یہ ہے کہ کم سے کم خرچ کرو، زیادہ سے زیادہ وصول کرو اور منافع کماؤ۔ اعلیٰ درجے کی تعلیم دینا، علم سکھانا اور اخلاقی تربیت کرنا ان کے پیش نظر ہے ہی نہیں۔ یہاں صرف ان علوم کی تعلیم دی جاتی ہے جن کی مارکیٹ ویلیو ہے۔ باقی جہاں تک ان علوم کا تعلق ہے جو معاشرے کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، کیونکہ ان کے لیے بھاری بھرکم فیسیں کوئی نہیں دیتا۔ انگلش میڈیم، مخلوط تعلیم، غیر مسلم اور غیر پاکستانی مصنفین کی کتب، غیر ملکی اداروں کے امتحانات اور نصابات اور اخلاقی پابندیوں کے بغیر کھلے ڈھلے ماحول نے ان تعلیمی اداروں کے اندر اسلامی اقدار اور رویوں کو تباہ کر دیا ہے۔

پرائیویٹ سیکٹر میں مذہبی تعلیم کا حال اور بھی پتلا ہے۔ دینی مدارس کافی تعداد میں ہیں لیکن ان کا ماحول ایسا ہے کہ معاشرے کے کھاتے پیتے لوگ اپنے بچے وہاں نہیں بھجواتے۔ یہ مدارس غریب غربا اور یتیموں کی پرورش گاہیں ہیں جہاں زیادہ تر زکوٰۃ وصدقات کے پیسوں سے اخراجات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کی مالی حالت بھی پتلی ہوتی ہے (ماسوائے منتظمین کے)۔ یہاں صدیوں پرانا نصاب

پڑھایا جاتا ہے اور جدید تقاضوں اور عصری ضروریات سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ تربیت کے تصور کا یہاں بھی فقدان ہے۔ حکومت بیرونی دباؤ پر ان کے خلاف محاذ کھولے رکھتی ہے، نہ ان کی اسناد کو تسلیم کرتی ہے اور نہ انہیں کوئی اہمیت دیتی ہے۔ جدید تعلیم سے جو کروڑوں بچے مستفید ہوتے ہیں اور جو چند ہزاران دینی مدارس سے نکلتے ہیں، ان کے ذہنی وفکری رویوں میں اتنا بُعد ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف دنیاؤں کے باسی معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ 'دینی قیادت' عوام الناس کے اخلاق وکردار اور ان کے معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتی۔ بس یہ ہے کہ لوگ اپنے بچے کچھے دینی جذبے سے مجبور ہو کر ان کے پیچھے جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھ لیتے ہیں اور جو ذرا دین دار ہیں وہ پنج وقتہ نماز بھی۔ مسلمان معاشرے میں تربیت کا ایک ادارہ کبھی خانقاہ ہوا کرتا تھا۔ اب تصوف کے نام پر یہاں یا تو عرس اور میلے ہوتے ہیں یا چند خاندانی گدیاں ہیں جن کا کاروبار مریدوں سے نذرانے وصول کرنا ہے۔ تزکیہ وتربیت، جو اس ادارے کا اصل مقصد تھا، وہ پیر اور مرید دونوں کی نظر سے اوجھل ہو چکا ہے۔

معاشرے میں ذہنی خلفشار، فکری انتشار اور اخلاقی بے راہروی کا ایک بڑا سبب آج کا الیکٹرانک میڈیا بھی ہے جو غیر رسمی تعلیم وتربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور جو یہود وہنود کی شہ پر اور ان کی مدد سے اسلام کی فکری اور اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ فحاشی، عریانی اور بے راہروی کو عام کرنے میں اور اسلامی اقدار کی بیخ کنی میں غالباً دوسرے اداروں کے مقابلے میں اس کا کردار زیادہ اہم اور موثر ہے لیکن ہمارے ٹی وی مالکان اور سینئر صحافیوں کو ذرا خدا کا خوف نہیں اور نہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کا پاس ہے کہ وہ قوم کے اخلاق بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں اور مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کو سکۂ رائج الوقت بنانے میں جتے ہوئے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے، ہمارے نظامِ تعلیم وتربیت کا، جس کے نتیجے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ 'تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم'، تاہم صورت حال کی اس نقشہ کشی سے مقصود مایوسی پھیلانا نہیں بلکہ ملک کے سوچنے سمجھنے والے اور ذمہ دار عناصر کے سامنے صورت حال کی سنگینی واضح کرنا ہے کہ نظامِ تعلیم وتربیت کی اسلامی تناظر میں اصلاح کی کتنی شدید ضرورت ہے۔

جب تک ہم یہ نہیں کریں گے موجودہ تعلیم کی اگر کثرت بھی ہو جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ کرپشن بڑھتی ہی رہے گی اور اس کا کبھی استیصال نہیں ہو سکے گا۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام.................. پتہ..................

فون..................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

تزکیۂ نفس

احمد جاوید

منافقت اور اس کا علاج

حکم ربانی:

'یاَ ☐ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ ○ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ' (الصف، ۶۱: ۳،۲)

'مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔'

'اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا۔'

(النساء ۴: ۱۴۵)

'کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔'

فرمان نبوی:

'آیۃ المنافق ثلاث: اذا حدث کذب، اذا أوتمن خان و اذا وعد اخلف'۔ (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق)

'منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اور امانت میں خیانت کرے۔'

'قال رجل لحذیفۃ رضی اللہ عنہ: یا ابا عبداللہ! ما النفاق؟ فقال: ان تتکلم بالاسلام و لا تعمل به۔' (مسند الامام الربیع)

'ایک آدمی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ نفاق کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: یہ کہ تم زبان سے تو اسلامی تعلیمات کا اقرار کرو لیکن ان کے مطابق عمل نہ کرو۔'

س: نفاق کسے کہتے ہیں؟

ج: نفاق کی اصولی تعریف یہ ہے کہ دل اور زبان متفق نہ ہوں۔اس کی دو بڑی قسمیں ہیں، اعتقادی اور عملی۔اعتقادی نفاق ایک قسم کا کفر ہے اور عملی نفاق، فسق۔اعتقادی نفاق کی تعریف یہ ہے کہ آدمی ایمان کا اظہار تو کرے مگر دل میں ایسا انکار رکھے جو ارادتاً ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقرار ظاہر کرنا اور انکار چھپانا۔جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

'اِذَا جَآئَکَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ o وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ o اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ' (المنافقون ۶۳: ۱، ۲)

'اے محمد! جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (از راہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق (دل سے اعتقاد نہ رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں برے ہیں۔'

نفاق عملی یہ ہے کہ دین کے احکام کو ماننے کے باوجود ان پر دانستہ اور اختیاراً عمل نہ کیا جائے جیسا کہ قرآن حکیم نے سورہ الصّف میں ان لوگوں کی نکیر کی ہے جن کے قول و فعل میں تضاد ہو۔

واضح رہے کہ اعتقادی نفاق کفر کی بدترین قسم ہے اور عملی نفاق فسق کی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، امانت میں خیانت کرتا اور وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔نیز فرمایا:

'لا الہ الا اللہ کلمۃ الف اللہ بھا قلوب المسلمین۔ فمن قال و اتبعھا بالعمل الصالح فھو مومن و من قالھا و اتبعھا بالفجور فھو منافق۔ (مسند الامام ربیع)

'یعنی لا الہ الا اللہ وہ کلمہ ہے جس سے اللہ نے مسلمانوں کے دلوں کو باندھ رکھا ہے پس جس نے یہ کلمہ پڑھا اور اس کے مطابق صالح اعمال کیے وہ مومن ہے اور جس نے یہ کلمہ پڑھا اور برے اعمال کیے وہ منافق ہے۔'

س: نفاق کا ضرر کیا ہے؟

ج: عملی نفاق کی دو حالتیں ہیں۔ پہلی حالت تو یہ ہے کہ آدمی اس نفاق میں مبتلا ہو مگر کسی وجہ سے اس کے ضرر کو محسوس نہ کرتا ہو۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس کا شکار تو ہو لیکن اس سے رہائی پانے کی خواہش بھی رکھتا ہو۔

پہلی حالت عموماً دو وجوہ سے پیش آتی ہے۔ ایک غلط عقائد اور دوسرے حب دنیا۔ اس کا علاج اصولاً تصحیح عقائد سے شروع ہوگا۔ ایسے شخص کی وہ غلطی دریافت کرنی چاہیے جس کی وجہ سے وہ اپنے نفاق کے نقصانات کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو پا رہا۔ عام طور پر اس غلطی کے دو سبب ہوتے ہیں (۱) اللہ کی رحمت کا غلط تصور اور (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کا غلط تصور۔ سب سے پہلے یہ باور کرنا اور کرانا چاہیے کہ اللہ کی رحمت اگر آخرت میں بھی نافرمانوں پر ایسی عام ہو کہ برے سے برا نافرمان بھی بخشا جائے تو اس کا سیدھا سادا مطلب تو یہ ہوا کہ، نعوذ باللہ، اللہ کے احکام محض مذاق تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان کے اس قدر خلاف ہے کہ خود یہ شخص بھی جو رحمت کا خود ساختہ تصور رکھتا ہے، اسے قبول نہیں کر سکتا۔ دوسرے سبب کا ازالہ بھی اسی نہج پر ہوگا کہ بلاقید اور عام شفاعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبدیت ہی نہیں بلکہ رسالت کے بھی منافی ہے کیونکہ اگر اس طرح کی شفاعت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمانا تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی بندگی پر اصرار کوئی معنی نہیں رکھتا اور وہ پیغام بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانوں کی اخروی نجات کے واحد ذریعے کے طور پر لے کر آئے۔ باقی رہی حب دنیا تو اس کی تعریف اور علاج نفاق کے بعد زیر بحث آئے گا۔

س: اس شخص کے لیے کیا علاج تجویز کیا جائے گا جو عملی نفاق میں مبتلا ہو، اس کے ضرر کو محسوس بھی کرتا ہو اور اس سے بچنا بھی چاہتا ہو؟

ج: اس معاملے میں علاج دراصل دو چیزوں کا ہوگا: ایک کسل اور دوسرے آخرت پر مطلوبہ یقین نہ ہونا۔ کسل کے علاج کا آغاز نماز باجماعت کی پابندی سے ہوگا اور رفتہ رفتہ دوسرے معاملات کا

بھی احاطہ کرے گا۔ جماعت کی پابندی کسل کی دونوں قسموں یعنی ذہنی اور جسمانی کا علاج ہے۔

آخرت پر مطلوبہ یقین پیدا کرنے کی بہترین تدبیر تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے جن کے قول و فعل سے اللہ کا خوف جھلکتا ہو، تاہم اگر اس طرح کی صحبت میسر نہ ہو تو آخرت سے متعلق آیات قرآنیہ، احادیثِ نبویہ یا کوئی مستند بیان بار بار پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ شروع میں اگر دل نہ لگے تو بھی یہ مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ اس میں کچھ رسوخ پیدا ہو جائے تو پھر موت کو یاد رکھنے کی مشق کرنی چاہیے، یہ آخرت کے یقین کو بھی کامل کرتی ہے اور عمل کے محرکات کو بھی تقویت پہنچاتی ہے۔

اسلام اور مغرب　　احمد جاوید

مغربی تہذیب کا چیلنج اور ہماری ذمہ داریاں

اصل چیلنج داخلی ہے

آج جس موضوع پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ ہماری موجودہ صورت حال سے متعلق ہے۔ یعنی ہماری صورت حال میں ایسی کیا کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں کہ ہمارے تمام بنیادی تصورات ہمارے ذہن سے بھی دور ہوتے جارہے ہیں، عمل تو دور کی بات ہے۔ ایک تو یہ اور دوسرا یہ کہ مغرب اس وقت اسلام کے خلاف تاریخ کی سب سے بڑی قوت بننے کی علانیہ تیاری کر رہا ہے اور یہ کوئی اتہام اور سازش تھیوری (Conspiracy Theory) نہیں ہے ایک واضح حقیقت ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس منظم تیاری کے مقابلے میں ہمارے دفاعی نظام کی موجودہ صورت حال کیا ہے؟ اور وہ کون سی ضروری چیزیں ہیں جو ہم نہیں کر پار ہے اور ہمیں بہر حال کرنی چاہئیں۔

اس سے پہلے ہم سلسلہ وار مغربی فکر و تہذیب کی تفہیم و تنقیح کے حوالے سے جو گفتگو کر رہے تھے اس میں آج ہمیں جرمن فلاسفر نطشے کے فلسفۂ اخلاق پر گفتگو کرنا تھی لیکن بوجوہ آج ہم اس سے صرفِ نظر کر کے مغرب کی بجائے اپنے آپ کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ جو باتیں ہمیں نطشے کے تصور اخلاق کے حوالے سے کہنا تھیں وہ ہم نطشے کو حوالہ بنائے بغیر اپنے بنیادی اخلاقی تصورات اور اقدار کی

حیثیت سے پیش کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ہم اپنی ہی اقدار پر کس حد تک ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے ہیں؟ اور اس میں ہم سارے عالم اسلام کی بجائے مقامی حوالے سے زیادہ تر اپنی صورت حال کا جائزہ لیں گے کیوں کہ جس دائرے میں کھڑے ہوئے لوگوں کو کام کی طرف راغب کیا جاتا ہے اسی دائرے میں موجود خوبیوں اور خرابیوں کو موضوع گفتگو بنانا چاہیے تا کہ مہمیز (Inspiration) زیادہ ہو اور فطری ہو، محض تخیلاتی نہ رہے۔

ہماری موجودہ صورت حال

اس وقت ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں اس میں امید ایک تصور ہے اور مایوسی ایک امر واقعہ ہے۔ یہ صورت حال ہے کہ امید باندھنے کے لیے آئیڈیلسٹ ہونا پڑتا ہے اور مایوس ہونے کے لیے گویا سارے اسباب تائید میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کو مزید واضح یوں کیا جا سکتا ہے کہ تہذیبوں کی تاریخ میں وہ تہذیبیں جو فنا کے رُخ پر چل پڑی ہوں ان کی ایک مشترکہ عادت ہوتی ہے۔ میسوپوٹیمیا سے بھی شروع کر لیں تو یہ اصول آپ کو صادق آتا دکھائی دے گا کہ تہذیبیں جب بحیثیت مجموعی فنا کے اسباب کو اپنے جسم میں جگہ دے دیتی ہیں تو اس کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ ان کی تمام اقدار اور ان کے تمام اصولِ زندگی محض ذہنی تصورات بن کر رہ جاتے ہیں عمل میں کہیں نہیں دکھائی دیتے ۔تو اس وقت ہم تہذیبوں کو لگنے والے اس وائرس کا شکار ہو چکے ہیں اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہم اپنے دین کے معاملے میں بظاہر بہت حساس ہیں ۔ اس حساسیت پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے کہ اس میں ہمارے لیے اُمید کا کیا سامان ہے، لیکن بہرحال یہ کہ ہم اپنے دین کی طرف سے بہت حساس ہیں، اس دین پر عمل کرنے کی صورت میں بھی اور اس دین پر عمل نہ کرنے کی حالت میں بھی۔ یہ ہماری ایک بڑی تہذیبی اور نظریاتی طاقت ہے کہ ہمارا بے عمل مسلمان بھی باعمل مسلمانوں کے مقابلے میں کم دینی حمیت نہیں رکھتا، یہ بہت بڑی قوت ہے لیکن اس تمام تر حساسیت کے باوجود یعنی اس صورت حال میں کہ ہم اللہ کے خلاف، اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اللہ کی کتاب (قرآن) کے خلاف اور اپنے دین کے خلاف حتیٰ کہ اپنی فقہ کے خلاف بھی کوئی بات نہیں سن سکتے، ہم اپنے اندر موجود تمام طاقتوں کو سمیٹ کر ایسی صورت میں دفاع پر آمادہ ہو جاتے ہیں یہ ہماری ایک نفسیات ہے اور یہ اس کا بہت مثبت پہلو ہے لیکن ہم وہ بعد میں دیکھیں گے سردست جو ہم دیکھنا اور دکھانا چاہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اتنی ہمہ گیر حساسیت کے باوجود ہمارا دین ہے کہاں؟ مطلب یہ کہ فرد کی زندگی اور اس کی ترجیحات میں اور اجتماعی زندگی کی اقدار اور اصول کے طور پر ہمارا دین ہے کہاں؟ تو اس صورت حال میں یہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ ہم ایک خواب کے ساتھ وفادار اور حساس ہیں لیکن اس خواب کو بیداری سے جوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے

نفسیاتی اور تہذیبی سٹرکچر میں یہ جو ایک بنیادی دراڑ پیدا ہوگئی ہے یہ وہ دراڑ ہے اور یہ وہ رخنہ ہے جسے اگر جلدی دور نہ کیا جائے تو تہذیبی سٹرکچر گر پڑتا ہے اور ہم اس رخنے کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمام تر تاویل کے باوجود ہم مسلم معاشرے کا کوئی ایک سٹرکچر ایسا بتا سکتے ہیں جسے ہم نمونے کے طور پر پیش کر سکیں کہ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقدار معاشرت کا زندہ نمونہ یا مسلم دنیا کی کسی ایک ریاست کو ہم اس اعتماد کے ساتھ پیش کر سکیں کہ یہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی ریاست کا تسلسل بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اب ہمارے پاس دکھانے کے لیے وہ افراد بھی بہت کم رہ گئے ہیں جن کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنائے ہوئے افراد کا تسلسل ۔اور ظاہر ہے انسان انہی تین دائروں میں موجود ہوسکتا ہے: اپنے فرد ہونے کے دائرے میں، معاشرت کے دائرے میں اور ریاست کے دائرے میں۔ چوتھا تو کوئی دائرہ موجود ہی نہیں ہے تو ان تینوں دائروں کا مرکزی نکتہ دین کو عملی حالت میں دکھا دینا ہوتا ہے جواب جھوٹ بولے بغیر اور دھوکہ دیے بغیر ممکن نہیں ہے۔تو ایک ایسی صورت حال میں جہاں ہم نے اپنے تمام بنیادی تصورات کو اپنی ذات اور اپنی صورت حال سے مکمل طور پر لاتعلق اور بے اثر کر رکھا ہو اس صورت میں اگر ہم یہ چاہیں کہ ہماری تہذیب اپنے اصول و اقدار کے ساتھ زندہ رہے اور دیگر تہذیبوں پر غالب آ جائے تو یہ ایک منافقانہ جذبہ تو ہوسکتا ہے لیکن اس جذبے کا حاصل صفر ہی رہے گا۔ہم بڑے سے بڑے خواب کو بیداری کے سامنے نہیں لا سکتے چاہے وہ خواب عرش الٰہی اور بیت اللہ ہی کا کیوں نہ ہو اور نہ ہم خواب کے عرش اور بیت اللہ کو بیداری کے صنم کدے پر غالب کر سکتے ہیں۔

چیلنج کا جواب

میں پہلے بھی اپنے احباب اور سامعین سے کہتا رہا ہوں اور آج پھر عرض کرتا ہوں کہ ہمیں پانچ چیزوں پر پورا اُترنا ہے ورنہ ہمارا نام بھی تاریخ کی طغیانی میں غرقاب ہونے والی قوموں کی فہرست میں درج ہوجائے گا۔اُن پانچ چیزوں میں سے دو چیزیں اپنے دین کے ساتھ تعلق کے حوالے سے ہیں اور تین چیزیں اپنے دین کا نمائندہ بن کر دنیا کے ساتھ متعلق رہنے کے بارے میں ہیں۔ہمیں اپنے دین کے ساتھ صداقت پر مبنی تعلق کے لیے درکار وہ دو سادہ سی چیزیں ہیں: ذوق عبادت اور حسنِ معاشرت۔ یہ کہ اللہ کے حضور میں رہنا ہماری سب سے بڑی رغبت بنے، اللہ کی جناب میں جھکنا ہماری سب سے بڑی خواہش بنے اور اللہ سے تعلق کی برکات پر مبنی معاشرت کا قیام ہماری سب سے بڑی کامیابی بنے۔تو یہ دو چیزیں اگر ہمارے مذہبی لوگوں نے محدود درجے میں بھی پوری کر کے نہیں دکھائیں تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے غداروں کا ٹولہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبعین کی جماعت نہیں ہے کیونکہ اس دین کو انسان میں جو جو اوصاف مطلوب ہیں اور اس دین میں انسانیت کے جو جو Types اللہ کو مطلوب ہیں وہ سارے اوصاف اور Human Types رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خدام کی جماعت میں کمال کو پہنچی ہوئی حالت میں دکھا چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب اللہ کو مطلوب کوئی وصف ایسا نہیں ہوسکتا جو صحابہؓ میں موجود نہ ہو اور اللہ کو مطلوب کوئی کمال ایسا نہیں ہوسکتا جس کے مظہر واحد صحابہؓ نہ ہوں اور اللہ کو مطلوب کوئی انسانی Order ایسا نہیں ہوسکتا جو صحابہؓ کے بنائے ہوئے انسانی Order سے مختلف ہو۔ تو یہ دین اپنی تسلیم اور تعمیل کے تمام مطلوبہ معیارات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے صحابہ کرامؓ کی شکل میں پورا کر چکا ہے اور اس میں کسی ایک جزو کے اضافے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ کسی بھی صحابیؓ پر نگاہ جما لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی بھی پروردۂ تربیت کو منتخب کر لیجیے آپ یہ دو چیزیں اس میں بدرجہ اتم پائیں گے۔ ایک یہ کہ وہ راتوں کا راہب ہے اور دوسرے یہ کہ وہ دن کا شہسوار ہے۔ ایک یہ کہ مصلے پر سجدے کی حالت سے سر اُٹھانے کو اس کا جی نہیں چاہتا اور دوسرے یہ کہ اپنی باقی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے وہ مصلے کا بہانہ نہیں بناتا۔ مطلب یہ کہ صحابیت ایک فرد میں جمع ہو کر بھی ذوقِ عبادت اور حسنِ معاشرت کا نمونہ ہے اور صحابیت ایک اجتماعیت پیدا کر کے بھی ان دو چیزوں کا مظہر ہے تو یہ جو ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت ہے یہ مسلم طبیعت، مسلم قلب، مسلم ذہن، مسلم ارادے اور مسلم عمل کی دو اقدار ہیں۔ ان دونوں ہی پر یہ دین اپنی تسلیم اور تعمیل کی پوری عمارت کھڑی کر کے دکھا دیتا ہے۔ اگر ان دو بنیادوں سے ہٹ کر دین کی کسی اور رنگ میں تاویل کر کے ہم کوئی سٹرکچر کھڑا کریں گے تو وہ دیوار کھڑی ہونے سے پہلے گر جائے گی، وہ اس دین کی اساس پر بنی ہوئی عمارت ہی نہیں ہوگی۔

ذوقِ عبادت

اس پہلو سے دیکھیں تو بہت پرانی بات نہیں بلکہ میری ہی نوجوانی کی بات ہے کہ ہر گلی میں، ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی تہجد گزار ہوتا تھا۔ ہر مسجد میں کبھی کبھی کوئی نماز میں بے اختیار روتا ہوا نظر آجاتا تھا۔ ہر مسجد میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوتی تھی جو مسجد کی صفائی وغیرہ کا کام اس طرح کرتے تھے جیسے اپنے محبوب کو سجایا اور بنایا جا رہا ہو۔ یہ سارے رویے اب معدوم ہیں۔ اب ہر مسجد کا ایک تنخواہ دار ملازم ہوتا ہے عموماً کام چور ملازم اور بے رغبت نوکر۔ وہ جو سارا محلہ مسجد کی خدمت کرنے کا ایک رویہ رکھتا تھا اب وہ بالکل ناپید ہے۔ اب وہ گلیاں ویران ہو چکی ہیں، جہاں ہر دوسرے گھر میں کوئی ایک تہجد گزار ہوتا تھا۔ اب وہ بستیاں صرف حافظے میں رہ گئی ہیں جہاں رات کو اُٹھ کر چلنے والا تہجد یا فجر کے وقت تلاوت کی

آوازیں گلی میں آتے ہوئے سنتا تھا۔ اب یہ پورا ماحول ختم ہو چکا ہے اور یہ جو ذوقِ عبادت ہے اب یہ معلمین عبادت میں نہیں رہ گیا (الا ماشاءاللہ) یعنی جو عبادت کے قوانین اور طریقے سکھاتے ہیں اب یہ ذوق اُن میں بھی نہیں رہا۔ یہی وہ ذوق عبادت تھا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ ’اللہ کا دوست وہ ہے جسے دیکھ کر اللہ یاد آ جائے‘ اور یہ اتنا سادہ اور اتنا مستقل معیار ہے کہ ہم سب اپنے آپ کو شیشے کے آگے کھڑا کر کے اس معیار کو دیکھ سکتے ہیں اور خانقاہوں اور مدرسوں کا چکر لگا کر بھی اس معیار کو فراموش ہوتے دیکھ سکتے ہیں۔

حسن معاشرت

دوسرا پہلو ہے حسنِ معاشرت کا۔ حسنِ معاشرت کی گاڑی خیر خواہی اور ایثار کے تیل سے چلتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ معاشرت ہمیں قائم کر کے دکھا گئے ہیں جہاں ہر شخص کے لیے اُس کے پڑوسی کا حق اُس کی اولاد سے زیادہ تھا۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ جو شخص اللہ کے آگے بھی سچے دل سے نہیں جھک سکتا جو اپنے بھائی کے آگے منکسر المزاج نہیں ہے جو اپنے ساتھی سے تواضع اور انکساری نہیں برتتا وہ رکوع کو اس جذبۂ بندگی سے ادا نہیں کر سکتا جس زورِ بندگی سے رکوع کرنا مطلوب ہے یعنی جو بندوں کے آگے منکسر نہیں ہے وہ اللہ کے آگے بھی منکسر نہیں ہو سکتا کیونکہ صلاحیتیں اللہ نے الگ الگ تھوڑی دی ہیں کہ میرے آگے انکسار تمہارے دائیں طرف رکھا ہے اور اپنے لوگوں کے لیے انکسار تمہارے بائیں طرف رکھا ہے۔ انکسار کا مادہ ایک ہے، جو اللہ کے آگے جھکا ہوا ہو، وہ بندوں کے آگے اپنی بڑائی پر اصرار نہیں کرتا اور اپنی مرکزیت کو تلاش نہیں کرتا۔ اب اس دنیا میں رہ کیا گیا ہے؟ دُنیاوی تعلیم حاصل کرو تو وہ بھی جیسے گھوڑوں کی دوڑ بن کر رہ گئی ہے۔ بس اگلے کو اپنے سے پیچھے دیکھنا ہے۔ اب دینی علم میں بھی بدقسمتی سے یہ مسابقت آ گئی ہے۔ اب دین میں بھی تعظیم طلبی، جاہ طلبی، مرکزیت طلبی، امامت طلبی......وغیرہ آ گئی ہیں۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ دو چیزیں ہیں جو اس زندگی میں دین کے ساتھ تعلق کو نتیجہ خیز بناتی ہیں۔ یہ دو چیزیں ہیں ذوقِ عبادت اور حسن معاشرت۔ ذوق عبادت یہ ہے کہ میں کہہ سکوں کہ یا اللہ! میرے دل میں جتنی رغبت اور محبت کی صلاحیت تھی وہ سب کی سب یکسو تھی تیری عبادت کی طرف۔ اگر مجھے اپنی رغبت پر چلنے کا موقع دیا جاتا تو میں سجدے سے کبھی سر نہ اُٹھاتا، میں مصلے کو کبھی نہ چھوڑتا، میں قرآن کی تلاوت کا پانچ منٹ کے لیے بھی وقفہ نہ آنے دیتا۔ لیکن میں نے اگر مصلے کو چھوڑا ہے تو اپنی رغبت کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ تیرے ہی کسی امر کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ تو یا اللہ! مصلے کو چھوڑنے کا جو

ایثار میں نے تیرے امر کے لیے کیا ہے اس ایثار کو میری بخشش کا وسیلہ بنا دے۔ کوئی ہے تم میں جو یہ کہہ سکے اللہ کو؟ اور اللہ سن لے اس کی یہ بات کہ ہاں! اس نے میرے سجدے کو مختصر کیا ہے میرے کسی اور امر کو پورا کرنے کے لیے آج کون کہہ سکتا ہے یہ جب کہ ایسا کہنے والے کچھ عرصہ پہلے تک ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ دوسری چیز جو ہمیں اس ذوق اور ان قدروں پر کھڑے ہو کر اپنے اندر Develop کرنی ہے وہ ہے حسن معاشرت تا کہ ہم دنیا میں کامیاب ہو سکیں، فلاح پا سکیں اور غالب آ سکیں۔ دُنیا میں ہمارے ذمے دو ہی ذمہ داریاں ہیں کہ اے اُمتِ محمدیہؐ! تم فلاح پا کر دکھاؤ اس دین کو اپنا زادِ سفر بنا کر اور تم غالب آ کر دکھاؤ اس علمِ حق کو اُٹھا کر۔ بس دنیاوی زندگی میں ہماری یہی دو بنیادی ذمہ داریاں ہیں۔ فلاح پانا اندرونی طور پر ہے اور غلبہ پانا بیرونی طور پر ہے۔

تین درکار صلاحیتیں

اب آگے بڑھیے! اس دنیا میں بقا اور غلبے کے لیے تین چیزیں ناگزیر ہیں۔ دینی فرائض میں، ایمانی واجبات میں اور مکاتب سنت میں۔ **ایک** اپنے زمانے میں موجود معیار ذہانت سے کم تر نہ رہنا۔ مطلب یہ کہ تمہارے زمانے نے ذہن کو جس سطح تک پہنچا دیا ہو، علم کو جس درجے تک پہنچا دیا ہو، اپنے آپ کو اس معیار سے کم تر نہ ہونے دینا۔ تو پہلی چیز ہے ذہانت، کیوں کہ جو قوم اور جو تہذیب بڑے تصورات، بڑے خیالات، بڑے نظریات اور بڑے عقائد رکھنے کے قابل نہیں رہتی وہ فنا ہو جاتی ہے۔ **دوسرا** جو اصول ہے وہ ہے اپنے زمانے کے معیار اخلاق پر حاوی ہونا۔ اپنے زمانے میں جو معیار اخلاقیات بن چکا ہو، اس کے مقابلے میں پسماندگی نہ اختیار کرنا بلکہ اُس سے بلند اور اس کے آگے رہنا۔ **تیسرے** جو کام کرنا اس کے لیے پوری اہلیت حاصل کرنا۔

تو یہ تین اصول ہیں دنیاوی زندگی میں حق کے نمائندے بن کر اپنی دو ذمہ داریوں یعنی فلاح اور غلبے کو پورا کرنے کے لیے کہ ذہن میں اقوامِ عالم سے آگے رہو، اخلاق میں ان سے بالاتر رہو اور استعدادِ کار میں دوسروں کے لیے نمونہ بنو۔ اب آپ ان تینوں پہلوؤں سے خود کو پرکھ لیجیے۔ آپ ہر لحاظ سے ان تین جہتوں میں اہل مغرب سے پیچھے ہیں۔ آپ اہل مغرب کو یا اسلام دشمنوں کو بعد میں جتنا چاہیے کوس لیجیے لیکن پہلے اپنا احتساب ضرور کیجیے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو جتنا آپ دوسروں کو کوستے ہیں اس سب کو جمع کر کے ایک ارب گنا زیادہ خود کو کوسنا چاہیے اور یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ آپ کو اللہ سے بے وفائی نے یہاں تک پہنچایا ہے کسی کی سازش نے یہاں نہیں گرایا۔

تیاری کی ضرورت

میری ناچیز رائے میں یہ وہ پانچ اصول ہیں جن کی ہماری طرف سے ہونے والی خلاف ورزی نے مغرب کو اتنا مضبوط اور ہمیں اس قدر کمزور بنا دیا ہے اور ان پانچ اصولوں کی طرف مراجعت کیے بغیر اور اپنی تین چار نسلوں کی قربانی دیے بغیر اور دنیا پرستی کا جو مذہب ہم نے عملاً اور حالاً اختیار کر رکھا ہے اسے چھوڑے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اہل حق ملت کے طور پر اپنی بقاء کا کوئی بندوبست کر سکیں یا خود اہل حق ملت کے طور پر اپنا تعارف کرا سکیں کیونکہ ہمارے دین کی ہر خوبی ہمارے لیے ماضی بعید میں ہے۔ ہم اپنے دین کی کسی بھی فضیلت کے فعال مظاہر آج نہیں دکھا سکتے۔ ایسا لگتا ہے ہمارے دین کی سب برکتیں پانچ سات سو سال کے بعد ختم ہو چکی ہیں۔ اب ہم اپنے ماضی کو Quote کر کے حال سے لڑنے چلے ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ دُنیا ایک لحاظ سے میدان حشر کا نمونہ ہے جس طرح قیامت کے دن کسی کی نیکی میرے کام نہیں آئے گی اسی طرح تاریخ کی یلغار میں بھی ہمارے اسلاف کے کارنامے ہماری نالائقیوں کا ازالہ نہیں بن سکتے۔ تو اس پر غور کر لیجیے اور اس پر بجائے اس کے کہ ایک آدمی بیٹھ کر لیکچر دے اور دس آدمی بیٹھ کر سنیں اور اس کے بعد فارغ ہو جائیں۔ بلکہ ہمیں اپنے آئیڈیلز کو عمل میں لانے کے لیے ایک مربوط، مفصل اور مستقل مجاہدے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے خود کو تیار کریں اور اس تیاری میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہ وعظ سننے اور سنانے سے بہت بڑا کام ہے کیونکہ لیکچر دینے والا بھی ایک جھوٹا اطمینان پیدا کر لیتا ہے کہ میں نے بات کہہ دی اور لیکچر سننے والا بھی ایک جھوٹی طمانیت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہاں بس ٹھیک ہے! یہ ایک تصور آ گیا۔ مطلب یہ کہ پہلے میں چار تصور جانتا تھا، اب پانچویں کو بھی اپنی کاپی پر لکھ لوں گا۔ اس کے علاوہ ان سب چیزوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ سب سے پہلے مجھے اور آپ کو ایک کائناتی تنہائی میں کھڑے ہو کر اللہ کے حضور میں یہ کہنے کے لائق ہونا چاہیے کہ یا اللہ میں صرف تیرا ہوں! یہ کہہ کر دیکھو اور یہ کہنے میں جو ڈر لگے اس سے لڑ کر دکھاؤ۔ اور پھر کرنے کی باتیں بہت سی ہیں مثال کے طور پر ہمارے ان بدترین حالات کا سب سے بڑا سبب ہمارے گھر ہیں یعنی ہمارے گھروں کا نظام تربیت ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح ہمارے مفادات ہمارے دین سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ہمارے وہ مقاصد جن کے لیے ہم لگے ہوئے ہیں، اُن میں سے کوئی ایک مقصد بھی ہمارے دین کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ ہمیں وہ چیزیں جو اندر سے متحرک کرتی ہیں، ان میں سے کوئی ایک محرک دینی نہیں ہے۔ نفسیاتی طور پر، اگر ہماری نفسیات میں ہمارے احساسات میں، ہمارے جذبات میں، دین اب کہیں رہ گیا ہے تو ایک غصے اور جارحیت کی شکل میں رہ گیا ہے۔ ہم دین

کے نام پر پانچ آدمیوں کو مار تو دیتے ہیں لیکن پانچ بیماروں کا علاج بھی کبھی ہم نے کروایا ہے، اسی دین کے نام پر؟ پانچ غریبوں کو کھانا بھی پہنچایا ہے اسی جذبۂ دینی کے ساتھ جس جذبۂ دینی سے تم پانچ کافروں کو مار رہے ہو؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غضب، وہ غصہ دینی حمیت سے نہیں پیدا ہوا، اپنے احساس جرم سے بچنے کے لیے تم نے بندوق اُٹھالی ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ تم جھوٹے بندے ہو، جھوٹے اُمتی ہو۔ اور بھائی! میں کس طرح کہوں کہ اپنی ہر تکلیف کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ اپنی ہر مصیبت کے لانے والے ہم خود ہیں۔ اب ہماری کوئی حیثیت نہیں رہی ہے کہ دنیا اپنی قوتوں کو Line up کرے ہم سے لڑنے کے لیے، تو یہ سب جو ایک Escapist کا رویہ ہوتا ہے کہ فلاں ہو گیا تو یہودیوں نے یہ کر دیا، فلاں ہو گیا تو عیسائیوں نے یہ کر دیا۔ فلاں ہو گیا تو کمیونسٹوں نے ہم پر یہ ظلم ڈھایا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ اگر بالفرض یہ سب کرنا بھی چاہتے ہیں تو تم کیسے لوگ ہو کہ تمہاری عصمتوں پر ڈاکہ ڈالنے کی ہر شخص کو آزادی ہے؟ تو پھر تم کس قابل ہو؟ اور تم کیا کر رہے ہو؟ تو بھائی میرے ذہن میں سب سے زیادہ قابلِ عمل صورت یہی ہے کہ آج سے ہم جائیں اور اچھے پڑوسی بنیں، رسول اللہ ﷺ کی سنت پر اچھے باپ اور اچھے بیٹے بنیں اور اللہ کے مطالبۂ صداقت پر خود کو پورا اُترنے کے لائق بنائیں اور اس بات کو اپنے تمام حلقۂ اثر میں عاجزانہ انداز میں پھیلائیں اور اس خبط میں مبتلا نہ ہوں کہ میں کسی تحریک کا محرک بن جاؤں، میں کسی انقلاب کا لیڈر بن جاؤں۔ یہ سب خبط ہیں۔ بس یہ منصوبے بناتے ہی بے برکتی قبضہ کر لیتی ہے۔ دنیا میں گمنام داعی بن کر رہو۔ تم دنیا میں ایسے آدمی بن کر رہو کہ تم سے اپنی زندگی سنوار لینے والے جب دعا کے وقت تمہارا نام یاد کرنا چاہیں تو پتہ چلے کہ وہ تو تمہارا نام بھی نہیں جانتے۔ شیخ الحدیث اور علامہ بہت بن چکے۔ اب رسول ﷺ کا سچا اور عاجز اُمتی بن کر دکھاؤ اور ان لوگوں کی طرح عمل کر کے دکھاؤ۔ پانچ آدمیوں پر میں محنت کرتا ہوں اور وہ پانچ آدمی جب مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں کہ اپنے اپنے حلقے میں جا کر تم بھی کام کرو اور کسی کا نام نہ لو۔ وہاں جا کر یہ نہ بتاؤ کہ یہ بات مَیں فلاں جگہ سے سیکھ کر آیا ہوں۔ بس اپنے طور پر کام کرو۔ تو اس کام میں پھر برکت پیدا ہوگی۔ جس دنیاوی چیز سے تمہیں محبت ہے اسے آج جا کر اللہ کے راستے میں دے دو۔ تم کیسے اتنی غریبی دیکھ کر ارام کی زندگی بسر کر رہے ہو؟ ہمارے اُستاد کہتے تھے، امیر آدمی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کو ہسپتالوں میں خادم کی حیثیت سے جانا چاہیے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کو غریب بستیوں میں آٹے کی بوری اُٹھا کر گھومنے والا بننا چاہیے۔ یہ سب کیے بغیر تم مغرب کو سمجھ جاؤ گے تو کیا کر لو گے؟ مزید ڈر جاؤ گے یا علمی انداز میں چیزوں کو Define یا Theorize کر لو گے تو کیا ہو جائے گا؟ اب وقت نہیں ہے۔ اب

بالکل وقت نہیں ہے۔ اب وقت ہے توبہ کا اور تجدید دین داری کا، تجدید دین کرنے والے بہت اٹھتے ہیں لیکن تجدید دینداری کرنے والے کم اُٹھتے ہیں۔ یہ تجدید دینداری کا وقت ہے۔ یہ کرنا اب ہماری بقا کی شاید سب سے بڑی شرط ہے۔

میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں کہ میں جن اُستادِ گرامی کا ادنیٰ شاگرد ہوں بلکہ مجھے شاگرد کہلانے کا بھی حق نہیں ہے ویسے ہی اپنا قد بڑھانے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ تو کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا تھا کہ وہ پانچ غریب بچیوں کی شادی نہ کروائیں، تین چار سو گھروں میں راشن نہ بھجوائیں اور وہ ڈھائی مرلے کے گھر میں رہے خود ساری عمر اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ ان کے گلی والوں کو جو سب غربا تھے، کھانے کی کوئی اچھی چیز نہ پہنچے۔ اور آپ اگر ان کے ملنے والے ہیں، آپ ان کے مشاہدے میں رہتے ہیں اور ان کو خبر ہو گئی کہ آپ بیمار ہیں تو جو صاحب سب سے پہلے آپ کی عیادت کو پہنچیں گے تو وہ وہ ہوں گے۔ اگر آپ کو کہہ دیا ہے کہ ۶:۱۳ پر تمہارے گھر آؤں گا تو ۶:۱۴ نہیں ہوں گے۔ وہ ۶:۰۰ بجے گلی میں آ کر گھڑی دیکھ دیکھ کر ٹہلیں گے اور ۶:۱۳ ہوتے ہی دستک دے دیں گے اور رات کو میں نے دو مہینے ان کے نوکر کی حیثیت سے گزارے ان کے مرض الموت میں۔ گھر میں اُن کے کوئی نہیں تھا اکیلے تھے تو میں انہیں تہجد کے وقت وضو کرواتا تھا (خود فجر پڑھنا دشوار تھا ہمارے لیے)۔ اُن کو میں فجر کی اذان سے دو گھنٹے پہلے وضو کرواتا تھا اور اُن کی جائے نماز تھی جو اُن کے اُستاد کی دی ہوئی تھی جو پھٹ گئی تھی اور ٹاٹ پر انہوں نے سی رکھی تھی۔ وہ مجھے کہتے تھے مصلے پر کھڑا کر دو اور آدھے گھنٹے کا قیام کرتے تھے پہلی رکعت میں اور اُس کے بعد جب اشراق سے فارغ ہوتے تھے۔ (مسجد جا نہیں سکتے تھے) تو اُس کے بعد کہتے تھے مجھے آ کر اُٹھاؤ۔ فجر سے ڈیڑھ پونے دو گھنٹے ~~پہلے مرض الموت میں مبتلا ایک بوڑھا شخص~~ آدھے گھنٹے کا قیام کرنے کے بعد اشراق کی دو چار رکعتیں پڑھ کر آواز دیتا ہے کہ مجھے اُٹھاؤ۔ یہ آج کا کوئی جوان آدمی کر سکتا ہے؟ اور ایک دِن اِس میں ناغہ نہیں ہوا۔ اُس دن بھی نہیں ہوا جس دن وہ ظہر کے بعد فوت ہوئے۔ آج کل کے لوگ تو اداکار معلوم ہوتے ہیں۔ اس کردار کے سامنے کون کھڑا ہوگا؟ اور اس میں کوئی دکھاوا نہیں۔ مسجد میں سلام پھیر کر ایک دم مسجد سے باہر نکل جاتے تھے۔ غریبوں سے لڑائی جھگڑے والی بے تکلفی رکھتے تھے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ آج کل کے مذہبی نوجوان تعلق میں سب سے بے حس ہیں اور اِن میں تعلق کی وضع داری ہے ہی نہیں۔ یہ آپ سے چھ مہینے تک ملتے رہیں گے، پھر اچانک غائب ہو جائیں گے۔ اور نہ اس پر کوئی شرمندگی کہ تم نے ایک وضع بنا کر مجھے دھوکہ دیا ہے۔ اور جس شخص میں احساسِ تعلق نہ ہو معاف کیجیے نہ وہ اللہ کا بندہ ہے، نہ وہ زید کا پڑوسی ہے، نہ وہ بکر کا باپ ہے اور نہ وہ عمرو کا بیٹا ہے۔ اور الحمدللہ! ہم اُس اُمت کے لوگ ہیں کہ اس دِین کو جو فرد چاہیے ہوتا ہے وہ تلاش کرنے پر مِل ہی جاتا

ہے تو چلو اِسی سے فائدہ اُٹھائیں اور ایسے لوگوں کو ڈھونڈیں، اُن کی صحت میں رہیں اور اپنے آپ کو ری کنڈیشن کروائیں۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی

اسلام اور مغرب

پروفیسر محمد زاہد صدیق مغل ☆

سائنسی علمیت اور اسلام (آخری قسط)

حامیان سائنس مسلم مفکرین کے دلائل کا جائزہ

پچھلی قسط میں دیے گئے دلائل سائنس کے حق میں دیے جانے والے اہم مثبت دلائل ہیں، اب ہم چند ضمنی دلائل کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۴۔ سائنس اور کلیسا میں مخاصمت کی کہانی

سائنس اور مذہب بالخصوص اسلام میں مفاہمت ثابت کرنے کی راہ میں بڑی رکاوٹ وہ تاریخی معرکہ مذہب وسائنس ہے جو یورپ میں سائنس اور عیسائیت کے درمیان ہوا اور جسے فتح کرنے کے بعد ہی یورپ میں سائنسی علمیت فروغ پا سکی ہے۔ مسلم مفکرین کے خیال میں سائنس اور عیسائی مذہب کے درمیان کشمکش درحقیقت سائنس اور مذہب کی مخاصمت کی بناء پر نہیں بلکہ عیسائی تعلیمات کی کمزوریوں اور چرچ کے ناروا رویے کی مرہونِ منت ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے چند ایسے واقعات کا سہارا لیا جاتا ہے جن میں چرچ کو سائنسدانوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ یہاں یہ اصولی بات سمجھ لینی چاہیے کہ تاریخی واقعات کی تعبیر کوئی سادہ مسئلہ نہیں یعنی تاریخ محض واقعات کو بیان کردینے کا نام

نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کا مطلب واقعات کو ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے بیان کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ حامیان سائنس کا مقصد بہر طور سائنس کی اسلام کاری ہے لہٰذا وہ معرکہ مذہب و سائنس کو عمومیت کے بجائے عیسائی مذہب سے خاص کر دیتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک تاریخی حقائق کی یہ تعبیر درست نہیں۔ قرون وسطیٰ بطور 'ظلماتی دور' (Dark Ages)، اور 'بادشاہ و چرچ ایک معاشرتی و سیاسی برائی' درحقیقت قرون وسطیٰ کی وہ مسخ شدہ تعبیرات ہیں جو جدیدیت پسند پروٹسٹنٹ عیسائی مفکرین اور عقلیت پرست لادینی فلسفیوں نے پیش کیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس دور کی جو تصویر کھینچی ہے ہمارے علماء تک صرف تصویر کا وہی رخ مشہور ہے۔ مسلمانوں کو یہ 'عیسائیت مخالف' تعبیرات اس لئے پسند آئیں کیونکہ وہ عیسائیوں کو اپنا فطری حریف گردانتے تھے اور استعماری غلبے کے بعد فی الحقیقت جن قوموں نے انہیں آزادی سے محروم کیا تھا وہ بالفعل عیسائی مذہب ہی کو ماننے والی تھیں۔ اسی لیے جب عیسائی علماء سے مناظروں کی ضرورت پیش آتی تو ہمارے علماء ہوبہو وہی باتیں دہرادیتے جو پروٹسٹنٹ مصنفین نے لکھی ہیں۔ اس طریقہ کار کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات علماء کرام عیسائیت پر کرتے تھے آج وہی اعتراضات مسلمان نوجوان علماء پر وارد کرنے لگتے ہیں، مثلاً علماء پاپائیت کو برا کہتے تھے تو جدید تعلیم یافتہ طبقے نے علماء

☆ نیشنل یونیورسٹی آف ایمرجنگ سائنسز (فاسٹ) اسلام آباد

پر اسلام میں پاپائیت قائم کر دینے کا الزام دھر دیا۔ علماء رہبانیت کی تنقیص کرتے تھے تو یہ طبقہ کہنے لگا کہ علماء بھی سائنس اور ترقی کی مخالفت کر کے رہبانیت سکھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مسلمان بالعموم اپنا مدمقابل آج بھی عیسائیت و یہودیت ہی کو سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت بطور ایک معاشرتی قوت (نہ کہ ایک نشانی) کب کی مر چکی، اب تو مقابلہ سرمایہ داری (بشمول لبرل اور اشتراکی سرمایہ داری) سے ہے جو تحریک تنویر سے برآمد ہونے والے نئے انسان یعنی (human being) کا اصل مذہب ہے۔
جدیدی مفکرین نے قرون وسطیٰ کا کچھ ایسا نقشہ تیار کیا ہے:

☆ اس دور میں بادشاہوں، نوابوں اور پادریوں نے مل کر عوام کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔

☆ پادری علم کے ٹھیکے دار بن بیٹھے تھے اور عوام کو علم سے محروم کر دیا تھا، عوام کو فکر کی آزادی حاصل نہ تھی، بلکہ علم کی پرچھائیاں بھی عوام تک نہ پہنچ پاتیں۔

☆ دینی معاملات میں پوپ نے سارا اختیار خود سنبھال رکھا تھا، جس چیز کو سفید کہہ دیا وہ سفید اور جسے سیاہ کہا وہی سیاہ۔

☆ کلیسا سائنس کا بطور خاص مخالف تھا، جہاں کسی نے کوئی نیا خیال پیش کیا اسے فوراً سزا دے

ڈالی، چنانچہ لوگ سوچنے سے بھی ڈرتے تھے اور ذہنی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا تھا۔
یہ محض ایک خیالی تصویر ہے جس کا حقیقت سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انسانی رشتوں کا جو احترام اس دور میں تھا وہ مغربی معاشروں میں اس سے پہلے اور بعد کبھی نہیں رہا۔ یہ بات تو مارکس تک نے تسلیم کی ہے کہ اس دور میں معاشی اعتبار سے کاریگروں اور پیشہ وروں کو آزادی حاصل تھی اور پیشہ ورانہ پنچائتیں (Guilds) ہر پیشے کے کام کا پورا انتظام کرتی تھیں۔ اس معاشی نظام میں اتنا عدل تھا کہ بعض اشتراکی جماعتیں معاشرے کی تشکیل انہی Guilds کے نمونے پر کرنا چاہتی ہیں۔ خالص عقل کے میدان میں قرون وسطیٰ کے مفکرین کا حال یہ تھا کہ انہوں نے ارسطو کی منطقی خرابیاں دور کیں۔ یونانی فلسفہ اس دور میں بھی پڑھایا جاتا تھا البتہ یہ لوگ فلسفے کو اپنے دین کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ بارہویں صدی میں مغرب پر ابن رشدؒ کے فلسفے کا شدید اثر ورسوخ تھا اور تیرہویں صدی کے سب سے بڑے عیسائی عالم اکوائناس کا کارنامہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے ابن رشدؒ کے فلسفے کو شکست دے کر عیسوی الٰہیات کو ارسطو کے فلسفے کی بنیاد پر استوار کیا۔ درحقیقت اس دور میں یونانی علوم کو ثانوی حیثیت دی جاتی تھی اور سب سے بڑا درجہ دینی علوم کا تھا۔ اس کے مقابلے میں پندرھویں صدی کے بعد سب سے اونچا مقام ان یونانی علوم کو دیا جانے لگا جن میں انسان کو مرکز کائنات سمجھ کر ہر مسئلے پر 'انسانی نقطہ نگاہ' سے غور کیا جاتا ہے (یہ طریق تحقیق تمام سائنسز میں سرایت کیا ہوا ہے)۔ درحقیقت سلطنت رومہ کے زوال سے نشاۃ ثانیہ تک تقریباً ایک ہزار سالہ وقفے کے دوران یورپ میں کیتھولک چرچ کا زور رہا، جو بحیثیت خود ایک جداگانہ اور مختلف تہذیب تھی جس میں قدیم یونانی اور رومی فکر کا اثر ورسوخ نہایت کم تھا اور اس دور میں یورپی فکر کا سلسلہ یونانی فکر سے کٹ گیا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کا مطلب مذہب کے مقابلے میں یورپ میں بے دین یونانی ورومی فکر کا احیاء تھا اور چونکہ اس دور کے جدیدیت پسند مفکرین وسائنس دان یونانی فکر ہی کو اصل علم سمجھتے تھے لہٰذا ان کے نزدیک مذہبی تعلیمات پر مبنی قرون وسطی جہالت کا شاخسانہ ٹھہرا (اس کا اندازہ ہمارے اصل مضمون میں دیے گئے بیکن کے خیالات سے لگایا جاسکتا ہے، خیال رہے بیکن کا شمار سائنس کے عمائدین میں ہوتا ہے)۔ کلیسا کے نظام میں یقینا خرابیاں (corruptions) تھیں مگر وہ ایسی زبردست بھی نہ تھیں جیسی پروٹسٹنٹ اور عقل پرست مصنفین نے پیش کی ہیں۔ اولاً تو چرچ عموماً ایسے ہی سائنسدانوں کو سزا دیتا تھا جو کھلم کھلا عیسائی تعلیمات کا انکار کرکے عوام الناس کو گمراہ کرتے، ان سائنسدانوں کی بے باکیوں کا اندازہ ایسے خیالات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب نیوٹن نے پہلی مرتبہ اپنا مکینیکل تصور کائنات (mechanical world view) پیش کیا تو بادشاہ نے پوچھا کہ تم نے اس ماڈل میں کہیں خدا کا ذکر کیوں نہیں کیا تو اس نے جواب دیا I do not need any God to explain this universe (یعنی اس کائنات کو سمجھنے کے لیے مجھے کسی خدا کی ضرورت نہیں)۔ اسی طرح ڈیکارٹ ((1556-1650 کا مشہور مقولہ ہے 'مجھے اجزاء ترکیبی دے دو میں تمہیں دنیا تخلیق کردوں گا۔ یہ خیال بھی عام کیا گیا کہ انجیل کے مطالعے کی طرح

فطرت کا مطالعہ بھی دینی فریضہ ہے اور گلیلیو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتا تھا کہ انجیل کو فطرت کے مطالعے کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ درحقیقت تمام تنویری (Enlightenment) مفکرین کے نزدیک ہر وہ شے جو انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے قابل رد تھی۔ چنانچہ وہ برملا معجزات، نبوت، وحی، مذہبی رسومات و عبودیت سب کا مذاق اڑایا کرتے۔ یہ تصور بھی سراسر غلط ہے کہ چرچ یونہی کسی سائنسدان کو پکڑ کر سزا دے ڈالتا، بلکہ چرچ ایسے باغی افراد کو باقاعدہ مجلس منعقد کروا کر اپنی پوزیشن واضح کرنے کا موقع دیتا جس کا طریق کار یہ ہوتا کہ چرچ مخالف سائنسدان چرچ کے نمائندہ سائنسدان کے سامنے سائنسی و الٰہیاتی دلیلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ اس کی بات تعلیمات بائبل کے خلاف نہیں، اور اگر چرچ مخالف سائنس دان (عیسائی تعلیمات کے خلاف) اپنے کفریہ نظریات کو صحیح ثابت کرنے سے قاصر رہتا تب اسے سزا سنائی جاتی۔ اسی قسم کی ایک مشہور مجلس گلیلیو کے ساتھ بھی کرائی گئی جہاں حرکت یا سکون زمین کے مسئلے پر گلیلیو کو شکست ہوئی اور اسے موت کی سزا دی گئی۔

پھر بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ چرچ ہر طرح کی غلطیوں سے مبرا تھا، لیکن چند واقعات کو بنیاد بنا کر چرچ کا کردار مسخ کرنا ایسا ہی ہے جیسے طالبان کے چند اعمال کو بنیاد بنا کر پوری طالبان تحریک یا پورے عالم اسلام کو بدنام کیا جائے۔ انسانی کمزوریوں کی بناء پر اخلاق، قانون و سزا میں چند کوتاہیوں (discripencies) کو مثال بنا کر پورے نظام کو رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں۔ پروٹسٹنٹ مفکرین بظاہر 'اصلاح مذہب' (Reformation) کا خوشنما نعرہ لے کر اٹھے تھے مگر حقیقتاً وہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے نکال کر فرد کا ذاتی مسئلہ بنا دینا چاہتے تھے اور اسی لیے وہ کلیسا کے مصلحین کے بجائے اس کے حریف کے طور پر سامنے آئے اور بالآخر ایک نئے فرقے کی شکل اختیار کر گئے۔ اس طرز کے پروپیگنڈوں کی مثالیں دیکھنا ہوں تو دور حاضر کے مسلم جدیدیت پسند مفکرین کا علماء پر غیض و غضب برسانا دیکھ لیا جائے یا برائے نام عورتوں کے حقوق کی جدوجہد کرنے والی تحریکوں کے خیالات پر غور کر لیا جائے جو چند واقعات کو بنیاد بنا کر 'مولوی کے اسلام' کو عورتوں پر ظلم کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں۔ فرض کریں (خدانخواستہ) آج سے سو دو سو سال بعد جدیدیت پسند طبقہ پوری طرح روایت پسند علماء کی تحریک پر غالب آ جائے تو کیا علماء کی تحریک کو مسخ کر کے پیش کرنا کوئی مشکل کام ہوگا؟ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ دیکھیے جناب یہ مولوی سائنس کے خلاف تھے، ان کے بڑے بڑے علماء لاؤڈ سپیکر، ٹی وی، تصویر وغیرہ کے خلاف تھے، یہ مرد کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے عورتوں کو گھروں میں بند رکھنا چاہتے تھے، یہ مذہب کے نام پر فرقہ واریت اور انتہا پسندی کو ہوا دیتے، انہوں نے القاعدہ اور لال مسجد جیسی تحریکیں برپا کیں وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ دور نہ جائیے، ذرا اپنے دور میں 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام پر رچائے جانے والے عالمی تماشے پر غور کر لیجیے۔

درحقیقت یورپ میں سائنس نے عیسائیت کو نہیں بلکہ مذہب کو شکست دے کر معاشرتی بالادستی قائم کی اور سائنس جہاں جاتی ہے وہاں لازماً مذہب اور مذہبی پیشواؤں کو بے دخل کرتی ہے۔ ایسی کوئی مثال نہیں دی جا سکتی کہ جہاں سائنس کے غلبے کے بعد مذہبی زوال نہ آیا ہو اور یہی وجہ ہے کہ سائنس کے مقابلے میں عیسائیت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں کیونکہ سائنس دونوں ہی کے بنیادی تصور انسان یعنی 'عبد' کے انکار

سے عبارت ہے۔

اسلامی تاریخ اور سائنس

اسلام اور سائنس میں مفاہمت ثابت کرنے کی ایک اہم دلیل 'سائنسی نما مسلمانوں' کا حوالہ ہوتا ہے مگر اس قسم کے حوالوں کی حقیقت اصل مضمون میں بیان کردی گئی تھی (دیکھئے ساحل، اگست ۲۰۰۷ میں مضمون سرمایہ دارانہ علمیت)۔ ابن خلدونؒ جیسے علماء کے بارے میں ماہرین طب اور فزکس ہونے کا دعویٰ کسی علمی شگوفے سے کم نہیں کیونکہ اسلامی تاریخ میں ان کا نام اسلامی علوم کے ماہرین کے طور پر مسلمہ حیثیت رکھتا ہے نہ کہ طبیب یا فزیشین وغیرہ۔ فرض کریں ایک لمحے کے لیے مان لیجیے کہ ابن خلدونؒ جیسے حضرات کسی درجے میں علم طب وغیرہ جانتے تھے لیکن یہ ان کی امتیازی خصوصیات نہیں بلکہ محض اضافی خصوصیات ہوسکتی ہیں جیسے کئی مرد حضرات گھرداری وغیرہ کے کاموں میں کچھ نہ کچھ مہارت بھی رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان علوم کی حیثیت اسلامی نظام علم میں کیا تھی؟ اسی طرح اسلامی تاریخ میں مساجد میں سائنسی تعلیم کے انتظام کا حوالہ دے کر بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلامی تاریخ میں سائنس کی تعلیم مذہبی علوم کے شانہ بشانہ دیے جانے کا رواج تھا۔ اولاً اسلامی تاریخ میں وہ شے ہی مفقود تھی جسے سائنس کہتے ہیں، کیونکہ سائنس کا مطلب ہے تسخیر کائنات اور تمتع فی الارض کو مقصد حیات و تعقل کی بنیاد بنالیا جائے اور اسلامی علوم یعنی کلام، فقہ اور تصوف میں اس کی کوئی جگہ موجود نہیں۔ سائنس کی بالادستی کا مطلب کلام، فقہ، تصوف اور عبادت کو ثانوی بنا دینا ہے۔ سائنسی علمیت، ترقی، تسخیر کائنات اور تصرف فی الارض جیسے تصورات اسلامی علمیت کے لیے کس قدر اجنبی ہیں ان کا اندازہ اس بات سے لگایے کہ فقہاء کرام نے جہاں اسلامی زندگی اور معاشرت و ریاست کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کی وضاحت کے لیے کتب فقہ میں مستقل ابواب اور فصلیں قائم کی ہیں وہاں ترقی اور تسخیر کائنات جیسے عنوانات کے تحت ایک فصل بھی نہیں ملتی، یعنی کسی فقیہ نے ایسا کوئی باب تو درکنار فصل بھی مرتب نہ کی جس میں ترقی یا تسخیر کائنات یا سائنسی تحقیقات کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہو۔ ایسے ہی کسی محدث نے بھی کتب احادیث میں ان موضوعات کے تحت احادیث جمع نہ کیں۔ اگر تسخیر کائنات، ترقی، معیار زندگی، آزادی، مساوات جیسے تصورات واقعی اسلامی علمیت کے 'اہم و مقصود' موضوعات ہوتے تو فقہاء یقینا ان عنوانات کے تحت شرعی مسائل بیان کرنے کی خاطر ابواب اور فصلیں لکھتے، محدثین چن چن کر ایسی تمام احادیث جمع کر ڈالتے جو ترقی اور دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کے جذبات ابھارنے والی ہوتیں۔ اس کے برخلاف ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ محدثین کرام کتب احادیث میں کتاب الرقاق اور کتاب الزھد جیسے عنوانات قائم کرکے وہ احادیث بیان کرتے ہیں جو تسخیر کائنات اور تصرف فی الارض کی خواہشات کم کرنے کا سبق دیتی ہیں۔ دوم اکثر و بیشتر یونانی علوم پڑھانے کی وجہ یہ تھی کہ علماء اپنے وقت کے کفر سے واقف رہیں، بالکل اسی طرح جیسے دور جدید کے چند مدارس میں مغربی فلسفہ اور سوشل سائنسز پڑھائی جاتی ہیں۔ سوم اگر کچھ عقلی علوم پڑھائے بھی جاتے تھے تو ان کی حیثیت ثانوی اور اضافی (supporting) نوعیت کی تھی۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اسلامی زندگی ممکن بنانے کے لیے بھی

ضروری صنعتیں چاہئیں مثلاً گھر، لباس، کھانے وغیرہ کے لیے مخصوص نوعیت کی ٹیکنالوجی (تدبیر) کی ضرورت پڑتی ہے اور امام غزالیؒ نے انہی علوم کو 'عقلی علوم' کہا ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ جن حضرات کو آج زبردستی مسلمان سائنس دان بنا کر پیش کیا جارہا ہے ہماری پوری تاریخ میں کبھی انہیں اس طرح پیش ہی نہیں کیا گیا۔ ہماری تاریخ میں کسی شخص کا ان (فرضی) سائنسی نما علوم کی حیثیت میں ذکر نہ ملنا بذات خود ان علوم کی حیثیت متعین کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ پھر سو سالہ تحقیق کے بعد بھی جدیدیت پسند حضرات کے ہاتھ ہماری ابتدائی ایک ہزار سالہ تاریخ میں پچاس ساٹھ سے زیادہ 'مسلم سائنس دانوں' کے نام نہ آسکے جن میں سے اکثریت زبردستی سائنس دان بنالیے گئے ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں جدیدیت کی صرف تین سو سالہ تاریخ سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سائنس دانوں کی فہرست تیار کی جاسکتی ہے؟ اسلامی تاریخ کو توڑ مروڑ کر اسلام کو سائنسی علوم کی آبیاری کرنے والا ثابت کرنے کی جدوجہد درحقیقت احساس کمتری اور سائنس کے نتیجے میں ہونے والی مادی ترقی سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں سائنس ثابت کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا اصل ہدف بھی تصرف فی الارض ہے نیز انسانی زندگی کے لیے کسی وحی کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان اس کائنات کو خود اپنے کلیات کے ذریعے سمجھ سکتا ہے۔ سائنس اسی دعوے کا نام ہے۔

۵۔ سائنس سے عروج اسلامی کا سورج طلوع ہونے کی امید

اوپر بیان کردہ تفصیلات کے بعد سائنسی ترقی سے اسلامی عروج کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے زہر سے تریاق کی امید کیونکہ سائنس جن مقاصد کو ممکن بناتی ہے ان کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر کسی کے نزدیک اسلامی عروج کا مطلب بھی تمتع فی الارض ہی ہے تو وہ بڑے شوق سے سائنس سے اسلامی عروج کی امید لگائے بیٹھا رہے۔ درحقیقت جو حضرات سائنسی ترقی میں اسلامی عروج دیکھتے ہیں ان کا اسلامی تصور عروج و زوال ہی غلط ہے۔ ہمارے متجددین حضرات کے پاس اسلامی عروج کا تصور یہ ہے کہ:

(۱) مسلمان سائنسی اور معاشی ترقی میں دیگر اقوام سے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ تصرف اور تمتع فی الارض کے لائق ہوجائیں (یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات ہر وقت مسلم دنیا کے GDP کا موازنہ غیر مسلم اقوام کے GDP سے کرتے رہتے ہیں)، (۲) مسلمان دیگر اقوام پر تسلط حاصل کرکے انہیں اپنا زیرنگر بنالیں۔ اسلامی عروج کے اس فلسفے کی غلطی عین واضح ہے کیونکہ اسلام کے عروج اور احیاء کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی انفرادیت و معاشرت عام ہوجائے یعنی زیادہ سے زیادہ لوگ مسلمان ہوجائیں اور مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں نہ یہ کہ وہ تمتع فی الارض کے قابل ہوجائیں۔ بالفرض اگر مسلمان سائنسی اور معاشی ترقی کے نتیجے میں اس قابل ہوجائیں کہ وہ امریکہ وغیرہ کی مانند کوئی مضبوط سرمایہ دارانہ ریاست قائم کرلیں لیکن اس کے نتیجے میں کوئی بھی شخص اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرے اور ہر فرد مرنے کے بعد جہنم میں چلا جائے تو یہ عروج اسلام کا نہیں بلکہ سرمایہ داری کا ہوگا۔ آخر اسلام کا ایسے عروج سے کیا واسطہ؟ اسلامی عروج کا مطلب 'اسلامی تصور کامیابی' (یعنی جہنم سے خلاصی

اور جنت کے حصول کی عقلیت) کا فرد کی زندگی کے ہر سطح پر عام ہوجانا ہے۔ اس مقام پر اسلام اور مسلمانوں کی شکست میں فرق کرنے کی ضرورت ہے، زوال اسلام کا مطلب اسلام کا پھیلاؤ معطل یا سست روی کا شکار ہوجانا ہے جس کی دوصورتیں ہوتی ہیں (الف) تبلیغ اسلام کے کام میں غفلت کی وجہ سے غیر مسلمین مسلمان ہونا بند ہوجائیں، (ب) دعوت، تزکیہ واصلاح کے کام سے کٹ جانے کی بناء پر مسلمان اسلام کے بجائے غیر اسلامی زندگی بسر کرنے لگیں۔ ایسا ممکن ہے کہ اسلام شکست کھا رہا ہو مگر مسلمان حکومتیں مضبوط ہو رہی ہوں کیوں کہ ایسی حکومتیں اسلام پھیلانے والی نہیں ہوتیں جس کی واضح مثالیں اندلس اور ہندستان کی اکثر و بیشتر حکومتیں مثلاً مغل سلطنت تھیں (دور حاضر میں تو ایسی مسلم ریاستوں کی بھر مار ہے جس کی ایک واضح مثال خود ہمارا ملک ہے)۔ برصغیر میں عروج اسلام کا دور وہ تھا جب خلجیوں اور لودھیوں کے ادوار میں سلسلہ صوفیائے چشت کا کام زور پر تھا۔ جب بڑی تعداد میں ایک کے بعد دوسرے صوفی بزرگ کی آمد آمد تھی اور بلا مبالغہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلامی ریاست حاصل کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ اسلامی انفرادیت ومعاشرت کا عموم ہو لیکن مغلوں کے دور میں ریاست کے پھیلاؤ کو انفرادیت ومعاشرت کے پھیلاؤ کے کام سے الگ کر دیا گیا اور نتیجتاً اسلامی انفرادیت معدوم ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ایک طویل عرصہ حکمرانی کرنے کے باوجود یہاں کی اکثریت آج تک غیر مسلم آبادی پر مشتمل ہے۔ جب اسلامی انفرادیت ہی عام نہ ہو تو اسلامی ریاست اجنبی اور 'غیروں' (outsiders) کی حکومت بن کر ایک ناجائز جبر لگتی ہے اور لوگ ایسی حکومت ختم ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستان میں زوال اسلام کا آغاز ریاست کے زوال سے تقریباً دوسو سال قبل شروع ہوا اور ریاست کا زوال ہمارے زوال کا آخری مرحلہ تھا نہ کہ ابتدائی یعنی ہم نے جو کچھ کھویا اس میں سب سے 'آخری' نہ کہ پہلی شے ریاست تھی۔ چنانچہ تاریخی طور پر اسلامی ریاست کا زوال اسلامی انفرادیت ومعاشرت کے زوال کے دوسو سال بعد وقوع پزیر ہوا مگر ہمارے مفکرین کی نظر صرف ریاست کے زوال پر مرکوز ہوکر رہ گئیں اور اس کے پس پردہ کارفرما عمل ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔ کم ازکم ہندوستان کی حد تک یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہاں زوال اسلام کا مطلب سلاسل تصوف کا انفرادیت، معاشرت وریاست کی سطح پر زوال تھا۔ جو حضرات سائنسی ترقی میں عروج اسلام کا خواب دیکھتے ہیں انہیں اندلس کی تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اگر سائنسی ترقی عروج اسلام کی ضمانت ہوتی تو اندلس کی اسلامی ریاست کبھی زوال پزیر نہ ہوتی کیوں کہ مسلمانوں نے عقلی اور یونانی علوم میں سب سے زیادہ ترقی اسی ریاست میں کی مگر دعوت وتبلیغ کا کام بالکلیہ معطل کر رکھا تھا۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ اندلس اسلامی تاریخ کی وہ واحد ریاست ہے جہاں اسلامی ریاست کے زوال کے بعد اسلام 'مکمل طور پر' معطل ہوکر رہ گیا۔ اسلامی تاریخ کی کوئی دوسری ریاست اسلام کی ناکامی کی اس سے بڑی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سائنس کے ذریعے اسلامی عروج کے خواب کے پیچھے درحقیقت 'مسلم قوم پرستی' کی مخصوص ذہنیت

کارفرما ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں صرف چند مختصر نقاط پر اکتفا کریں گے۔

☆ استعماری غلبے اور اپنی آزادی چھن جانے کے بعد مسلم مفکرین کے پاس فرصت کے اتنے طویل لمحات میسر نہ تھے کہ وہ اپنے زوال کی وجوہات پر گہرے اور علمیاتی منہج پر مبنی غور وفکر کے بعد مستقبل کے لیے کوئی پائیدار لائحہ عمل مرتب کرتے۔ وقت کا تقاضا یہی تھا کہ فوری حل پیش کیا جائے اور ابتری کی اس حالت میں انہیں سر سید احمد خاں جیسے مفکرین کی یہ بات معقول نظر آئی کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ سائنس و ٹیکنالوجی اور مادی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانا ہے اور یورپی اقوام کے عالمی تسلط کا راز اس کی زبردست سائنسی علمیت اور قوت میں پنہاں ہے جس کے ذریعے وہ تسخیر کائنات اور تمتع فی الارض میں کامیاب ہو گئے۔

☆ اس فکر سے جو حکمت عملی مرتب ہوئی اس کا حاصل یہ تھا کہ مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام سائنسی علمیت اور ٹیکنالوجی میں جلد از جلد مہارت تامہ حاصل کرنا ہے تاکہ وہ بھی زیادہ سے زیادہ معاشی ترقی یعنی تمتع فی الارض کے قابل ہو کر اپنے دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکیں

☆ اس تجزیے کے پیچھے دو مفروضات کارفرما تھے: اولاً مسلمانوں کے زوال کا مطلب ان کا معاشی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانا ہے۔ دوم مسلمان انہی معنی میں ایک قوم ہیں جن معنی میں دیگر اقوام ہیں صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ یہاں قدر مشترک (uniting factor) اسلامیت ہے

☆ اس حکمت عملی کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے مسلم متجددین کو تین محاذوں پر کام کرنا پڑا: اولاً انہوں نے اسلام کی تعبیر وتشکیل نو کا بیڑا اٹھایا کیونکہ 'ملا کے اسلام' میں ہرگز یہ گنجائش موجود نہ تھی کہ وہ سائنسی علمیت کا اسلامی جواز فراہم کر سکے لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ اسلام کی معتبر تاریخ اور اجماعی تعبیر کو رد کر کے الٰہیات کی ایسی نئی تعبیر وتشکیل کی جائے جو 'موجودہ زمانے کے تقاضوں' سے ہم آہنگ ہو ماوراء اس سے کہ وہ تقاضے بذات خود اسلام میں جائز ہیں یا ناجائز۔ گویا اس تحریک کے ہمنواؤں کے خیال میں مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ ان کی عملی کوتاہیاں نہیں بلکہ اس اسلامی علمی (epistemological) تعبیر کی خرابی تھی جو انہیں اسلاف سے ورثے میں ملی، لہٰذا کرنے کا اصل کام مسلمانوں کی اصلاح و ارشاد نہیں بلکہ اسلامی علمیت کی تشکیل نو (Reconstruction) و اصلاح (Reformation) ٹھہری۔ یہ مفروضہ کہ اصلاً مغرب ہماری ہی علمیت کی روح ہم سے لے کر ہم سے آگے نکل گیا ہے لہٰذا اب ہمارا کام یہ ہے کہ سائنس کے اس غبارے کا دھاگہ کسی طرح پکڑ کر اس پر اسلام لکھ دیں، نیز اسلامی تاریخ میں 'سائنسی مسلمانوں کی تلاش' اسی فکر کے شاخسانے ہیں۔ دوم مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کے فروغ کیلئے جدید تعلیمی اداروں کا جال پھیلانا، اور سوم مسلم قوم پرستی کے جذبات کی آبیاری کے لیے 'مسلمانوں کے (سرمایہ دارانہ) حقوق' (مثلاً سرمایہ دارانہ نظم میں انکے معاشرتی، معاشی، تعلیمی وسیاسی حقوق کے تحفظ) پر مبنی سیاسی جدوجہد مرتب ومنظم کرنا۔ قوم پرستی یہی ہے کہ ایک مخصوص گروہ کے مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے اور مسلم قوم پرستی کا مطلب مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے (یاد رہنا چاہیے کہ قوم پرستی سرمایہ داری کی مختلف تعبیرات میں سے ایک تعبیر ہے)۔ جب یہ

اصل الاصول مان لیا جائے کہ 'ترقی' ہی معاشرتی وریاستی عمل کی بنیاد ہے تو اس کے پھیلاؤ کے لیے قوم پرستی کا نظریہ اپنایا جاتا ہے، یعنی یہ اصول کہ ترقی تو ہو مگر میری قوم کی، ارتکاز سرمایہ ہو مگر میرے ملک وقوم میں۔ مسلم قوم پرستانہ دعوت کی دو بنیادی خصوصیات ہیں: (الف) سرمایہ دارانہ ریاستی نظام میں مسلمانوں کی شمولیت کا جواز اور اصرار (ب) مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ۔ مسلم قوم پرستانہ تحریکوں کو مسلمانوں کی اصلاح وارشاد کی نہیں بلکہ ان کے مفادات کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ اداروں کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں، ان کی دعوت کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ اسلام مسلمانوں کے حقوق اور مادی مفادات کا ضامن ہے اور اصلاً تمام سرمایہ دارانہ اقدار اسلام ہی کی عکاس ہیں۔ یہ تحریکیں سرمایہ دارانہ انفرادیت کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں تا کہ مسلم دل کی دھڑکن بھی آزادی، ترقی، جمہوریت وغیرہ بن جائے۔ وہ اسلام کو ایک ثقافتی نشانی (cultural symbol) کے طور پر تو استعمال کرتی ہیں مگر اس کی تحکیم کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس تحریک میں اسلام کا کردار حصول ترقی کے لیے محض قوت متحرکہ ورابطہ (motivating and binding force) فراہم کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ قوم پرستی استعمار مخالف ہوتی ہے لہٰذا مسلم قوم پرست بھی پورے خلوص کے ساتھ استعمار کی مخالفت کرتا ہے۔ قوم پرستانہ جدوجہد کے جواز اور اس کی دلیل کے بنیادی مقدمات یہ ہوتے ہیں کہ 'مغرب ہم پر غالب ہے، ہمارے زوال کی اصل وجہ سائنسی علمیت کا نہ ہونا ہے، سائنسی علمیت اصلاً ہماری ہی علمیت ہے، اگر سائنسی علمیت غلط ہوتی تو مغرب ہم پر غالب نہ آتا۔ ان تحریکوں کا اعتراض یہ نہیں ہوتا کہ ہم پر ایک غیر علمیت کیوں مسلط ہے بلکہ ان کی پکار یہ ہوتی ہے کہ اس علمیت سے نکلنے والا عدل اور حقوق ہمیں کیوں فراہم نہیں کیے جا رہے؟ ہمارے ذرائع پر غیروں کی بجائے ہمارا قبضہ کیوں نہیں؟ ہمارے مزدور کو کم اجرت کیوں ملتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ خیال رہے کہ ہم یہاں کسی کے خلوص پر شک نہیں کر رہے، انیسویں صدی کے حالات میں جو ممکن نظر آیا ان حضرات نے اپنے تئیں پورے خلوص کے ساتھ کیا۔ البتہ اس حکمت عملی سے شریعت اور علوم اسلامی کا غلبہ ممکن نہیں کیونکہ قوم پرستانہ اہداف کے ساتھ مسلمانوں کی مادی ترقی اور سرمایہ دارانہ مفادات کا تحفظ تو ممکن ہے مگر اسلام کا عروج ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے جیسا کہ پچھلی ایک صدی سے زائد عرصے پر محیط جدوجہد سے عین واضح ہو چکا۔

ہماری ان سائنس مخالف گزارشات کا مطلب کہیں یہ نہ سمجھیے کہ ہم امر حقیقی (ground realities) سے آنکھیں چرا رہے ہیں، یہ بات کہ 'سائنس موجودہ دنیا کا غالب ترین علم ہے' ایک حقیقت اور کڑوا ہی صحیح مگر سچ ہے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ کسی شے کا غلبہ اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں۔ اگر غلبۂ شر کی صورت میں احساس گناہ ہی دبا دیا جائے تو تبدیلی محال ہو جاتی ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ ہر انقلابی عمل میں تبدیلی کی پہلی سطح 'فساد' (distruction) ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ اس انقلابی تبدیلی کے عمل میں سائنس کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے ایک نہایت مشکل سوال ہے اور ہمیں یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے پاس فی الحال اس کا کوئی واضح اور کافی وشافی جواب موجود نہیں۔

درحقیقت اصلاً یہ کام ہم جیسے طالب علموں کا نہیں بلکہ علمائے کرام کے کرنے کا ہے کہ وہ بتائیں کہ مسلمانوں کے لیے سائنس بطور حکمت عملی (strategy) نہ کہ بطور قدر (value) اپنانے کا جائز اور درست دائرہ کار کیا ہے، البتہ یہاں چند اصولی باتیں گوش گزار کی جارہی ہیں:

☆ یہ بات درست ہے کہ مسلمانوں کو کفار سے مقابلے کے لیے قوت حاصل کرنی چاہیے، مگر قوت حاصل کرنے کا مطلب یہ کہاں سے نکل آیا کہ:

الف) اب اسی علم کو اصل مقصد بنالیا جائے؟

ب) معاشرتی اداروں کی تشکیل اور ریاستی فیصلے بھی اسی علم کی بنیاد پر ہونے لگیں؟

ج) زندگی کی معنویت، افراد و معاشرے کی کامیابی و ناکامی کے معیارات بھی اسی علم کے حصول سے ملحق کر دیے جائیں؟

د) معاشرے کے سارے افراد اصل علم کو چھوڑ کر محض اس ایک علم کے حصول کی فکر میں لگ جائیں؟

ھ) ریاستی سرپرستی بھی اسی علم کو حاصل ہونی چاہئے؟ نیز یہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ٹھہرے کہ وہ افراد کو اس علم کے حصول کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے؟

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر حصول قوت کے پس پردہ لذات نفسانیہ اور سامان تعیش سے لطف اندوز ہونے کا جواز فراہم کیا جارہا ہوتا ہے جس میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا مسلمانوں کو ایٹم بم حاصل کرنے کے لیے لاکھوں کروڑوں سائنسدانوں یا پورے سائنسی معاشرے کی ضرورت پیش آئی؟ چنانچہ دیکھنا چاہیے کہ یہ دلیل دینے والا شخص پابندی شرع کا کتنا لحاظ رکھنے والا ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم سائنس و ٹیکنالوجی کو محض 'مجبوری' اور 'ناگزیر حکمت عملی' نہیں بلکہ 'جائز و مستحسن نعمت' اور 'قدر' سمجھتے ہیں اور اسی لئے ہم اس کے وکیل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

☆ پھر حکمت عملی (strategy) کے تناظر میں حصول ٹیکنالوجی کی بنیاد پر سائنس کا جواز فراہم کرنا بھی محل نظر ہے کیونکہ اصولاً سائنس اور ٹیکنالوجی میں فرق ہے جبکہ عام طور پر انہیں ہم معنی الفاظ ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی کا مطلب تدبیر (technique) ہے اور اس سے مراد کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع کو استعمال کرنے کا طریقہ ہے (method of using resources to achieve a desired end)، جب کہ سائنسی جستجو کا مطلب کائناتی قوتوں پر ارادہ انسانی کے تسلط کو مقصد حیات سمجھنا ہے۔ کفار سے مقابلے کے لیے جہاز اور بم وغیرہ کی ضرورت اصلاً ٹیکنالوجی کی احتیاج ہے نہ کہ سائنس کی اور اس احتیاج کے نتیجے میں لائی جانے والی ایجاد کا مقصد کفر سے مقابلہ ہوگا نہ کہ تصرف فی الارض، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ جہازوں اور بموں کے ساتھ ساتھ مسلمان سائنسی تحقیقات (scientific investigation) کو بطور ایک مستقل قدر اپنا کر تسخیر کائنات اور تصرف فی الارض کا کام سنبھال لیں گے (مثلاً ان کی جستجو کا حاصل یہ نہیں ہوگا کہ ہوا کا رخ کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے،

Genetics کی تحقیقات کے ذریعے کیسے انسانی ارادے کے مطابق صفات کا حامل بچہ پیدا کیا جا سکتا ہے، Rejuvenation یعنی ہمیشہ جوان رہنا کیسے ممکن ہے وغیرہ)۔ چنانچہ سائنس کی طرف مسلمانوں کا رویہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ غلبہ اسلام کے بعد مسلمان اس کے حامی اور مؤید بن کر سامنے آ جائیں اور 'بھرپور زندگی' گزارنے کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے کا علم اٹھا لیں۔ جب زہد، فقر اور تقویٰ پر مبنی اسلامی شخصیت کا معاشرتی غلبہ عام ہوگا تو سائنسی ایجادات عبث ہوتی چلی جائیں گی کیونکہ ان ایجادات کو ممکن بنانے اور جاری رکھنے کے لیے جس قدر دنیاوی جدوجہد اور انہماک درکار ہے وہ اسلامی انفرادیت کے لیے اجنبی ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا **من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ** (یعنی بے کار کاموں کو ترک کر دینا انسان کے اسلام کی خوبی ہے)۔ انبیاء کا طریق کفار کی اس مال و دولت پر قبضہ کرنا نہیں ہوتا جو لوگوں کی گمراہی کا سبب بنتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول یہ دعا نہ مانگتے:

'**رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّ اَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ**' (یونس ۸۸) "اے ہمارے رب بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیاوی زندگی میں اسباب زینت اور مال و دولت (کی کثرت) دے رکھی ہے، اے ہمارے رب (کیا تو نے انہیں یہ سب کچھ اس لیے دیا ہے) تاکہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بہکاتے پھریں۔ اے ہمارے رب تو ان کے اموال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو (اتنا) سخت کر دے کہ وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں حتی کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں"۔

دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا یوں نہ مانگی کہ 'اے ہمارے رب پہلے ان کے اموال ہمارے حوالے کر دے'، نہیں' بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے اموال نیست و نابود کر دے۔

تبصرۂ کتب　　　ڈاکٹر محمد امین

ترکی میں احادیث کی جدید موضوعی تدوین

از ثاقب اکبر

عرصہ سے ہم سن رہے تھے کہ ترکی میں احادیث پر نیا کام ہو رہا ہے لیکن اس کی تفاصیل دستیاب نہ تھیں۔ پچھلے دنوں ثاقب اکبر صاحب اور ان کے ادارے کا تعارف ہوا تو البصیرہ کی مطبوعات میں 'ترکی میں احادیث کی جدید موضوعی تدوین ۔ضرورت و اہمیت' نامی کتابچے پر بھی نظر پڑی۔ اسے منگوا کر دیکھا

اوراس کا تعارف قارئین البرہان کی خدمت میں حاضر ہے۔

ثاقب اکبر صاحب اسلام آباد کے دینی اسکالر ہیں۔مسلکاً اہل تشیع میں سے ہیں اور قم (ایران) کے فارغ التحصیل ہیں لیکن وسعت نظر کے حامل ہیں اور سارے مکاتب فکر کے علماء کرام سے رابطے میں ہیں۔ وہ امت کا درد رکھتے ہیں اور اتحاد بین المسالک اور اتحاد امت کے داعی ہیں۔ ان کی مختلف علمی کاوشوں میں سے ۶۰ صفحات کا یہ کتابچہ ترکی میں احادیث کی جدید موضوعی تدوین پر بھی ہے جو ان کے دورۂ ترکی کا نتیجہ ہے جس میں انہیں اس پراجیکٹ کے انتظامی سربراہوں سے ملنے اور ان کے خیالات سے استفادے کا براہ راست موقع ملا۔

یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ جس وفد کے ہمراہ تھے، اس میں 'اتحاد تنظیمات مدارس اسلامیہ' کے زعماء شامل تھے (یہ پاکستان کے دینی تعلیم کے پانچ وفاقوں کی کنفیڈریشن ہے اور ہر وفاق کا صدر اور جنرل سیکرٹری اس کا رکن ہوتا ہے) اور اس دورے کا اہتمام ایک امریکی تنظیم (انٹرنیشنل سنٹر فار ریلیجن اینڈ ڈپلومیسی واشنگٹن) نے وفاقی وزارت تعلیم کے تعاون سے کیا تھا جس میں بعض پاکستانی بھی کام کرتے ہیں (جو اس سے پہلے جماعت اسلامی کے پروفیسر خورشد احمد صاحب کے ادارے 'انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز' سے وابستہ تھے)۔ یہ تنظیم اپنی بعض ہم خیال دیگر تنظیموں کے ساتھ مل کر اور پاکستان میں اپنی شاخیں (اسی نام سے یا نام بدل کر - جیسے بلیک واٹر پاکستان میں نام بدل کر کام کر رہی تھی اور رحمن ملک صاحب قسم کھا کر کہتے تھے کہ بلیک واٹر پاکستان میں کام نہیں کر رہی اور ظاہر ہے وہ ان معنوں میں ٹھیک کہتے تھے کہ بلیک واٹر یہاں دوسرے نام سے کام کر رہی تھی) قائم کر کے دینی مدارس اور علماء کرام پر کام کر رہی ہے۔ ان کے ایک حامی اور کارکن جاوید غامدی صاحب کے شاگرد عزیز گوجرانوالہ کے عمار ناصر بھی ہیں۔ ان اداروں کی امریکی سرپرستی اور ان لوگوں کی مغرب نوازی ظاہر و باہر ہے (ان امریکی تنظیموں کا ایجنڈا اور مفادات کیا ہیں - یہ ایک الگ اور تفصیلی نشست کا متقاضی موضوع ہے، جس پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ ہمارے علماء کرام اور دینی مدارس کے لوگ اپنی سادگی بلکہ سادہ لوحی کی وجہ سے ان امریکی تنظیموں کے چلانے والے افراد کی فراست و ہوشیاری کے ہاتھوں استعمال ہو جاتے ہیں۔

تو ہم یہ عرض کرنا چاہ رہے تھے کہ ترکی میں حدیث کی جدید موضوعاتی تدوین ایک اچھا علمی پروجیکٹ ہے جو قابل تعریف ہے۔ ہم خود محدود سطح پر اس کام کو کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور برصغیر کے کئی اہل علم نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے جب احادیث کے مجموعے تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئے تو ان کی تبویب اس وقت کے حالات اور علمی ترقی کے

مطابق ہوئی تھی اور آج احادیث رسول ﷺ کو جدید موضوعات کے مطابق از سرنو مدون کرنے میں کوئی ہرج نہیں بلکہ ہماری رائے تو یہ ہے کہ اسی طرح کا کام موضوعات قرآن حکیم پر بھی ہونا چاہیے۔ 'منشور القرآن' کے نام سے قرآن حکیم کی موضوعاتی تدوین جدید کا جو کام ہوا ہے وہ پہلے کیے گئے کاموں سے کافی مختلف اور بہتر ہے تاہم اس میں ابھی بہتری کی بہت گنجائش موجود ہے۔

ترکی کے اس پراجیکٹ میں جو پہلو توجہ طلب یا ایک لحاظ سے تشویش کا ہے، اس پر جناب ثاقب اکبر صاحب نے بالواسطہ طور پر تو گفتگو کی ہے لیکن اس پر فوکس کر کے اسے موضوع گفتگو نہیں بنایا لہٰذا یہ خدمت اب ہم انجام دینے کی کوشش کریں گے۔ یہ موضوع ہے حدیث کی تعبیر و تشریح جدید کا جو کہ ترکی والے پراجیکٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ ظاہر ہے جب ہم قرآن وسنت کو قیامت تک کے لیے مصدر ہدایت مانتے ہیں تو زمان ومکان کی تبدیلی، تمدنی ترقی اور دیگر تہذیبوں سے تعامل وغیرہ کے نتیجے میں نوآمدہ مسائل میں ہمیں اجتہاد کرنا پڑے گا اور متون قرآن وسنت کی نئی تعبیر وتشریح کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن سوال اس کام کے طریق کار اور دائرۂ کار کا ہے اور ان حالات کا ہے جن میں ہمیں یہ کام کرنا ہے۔

حالات اس وقت یہ ہیں کہ مغربی تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اسلام اور اس کی تہذیب مغلوب ہے۔ مغربی تہذیب اپنی فکری اساسات میں ملحدانہ اور خلاف اسلام ہے اور قرآن وسنت غیر مبرہن طور پر اس تہذیب کے علم بردار یہود ونصاریٰ کی اسلام و مسلم دشمنی سے ہمیں متنبہ کرتے ہیں۔ ان قوموں نے ہمیں غلام بنایا، ہمارے وسائل لوٹے، ہمارے اداروں کو تباہ کیا اور صرف ہمارے علاقے اور ملک فتح نہیں کیے بلکہ ہم لوگوں کے دل ودماغ فتح کرنے کی پلاننگ اور جدوجہد کی تاکہ ہم ان کا دین یا کم از کم ان کی تہذیب اختیار کر لیں اور ہمیشہ ان کے غلام رہیں۔ اس میں بھی وہ کامیاب رہے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد جو بری بھلی اور جزوی آزادی عالم اسلام کو ملی اس کے نتیجے میں معاشرے اور اس کے اہم طبقات خصوصاً مسلمان حکمران آج بھی ان کی مٹھی میں ہیں اور وہ نظام تعلیم، میڈیا، جمہوریت، مالی امداد، فوجی معاونت، فیملی پلاننگ جیسے بے شمار معصوم اور پرامن عنوانات کے پردے میں مسلم معاشرے اور ریاستوں کی پالیسیوں پر غالب وقابض ہیں اور جب اس کے باوجود کچھ مسلمان ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہوگئے تو مغربی قوتیں جمع ہو کر اپنی مہیب جنگی مشینری کے ساتھ حیلے بہانے مسلمان ممالک پر حملہ آور ہوگئیں۔ عراق کو تباہ وبرباد کیا، افغانستان کا تورا بورا بنایا، لیبیا پر قبضہ کیا، پاکستان پر حملے جاری ہیں اور ایران کا گھیراؤ اور اس پر شدید دباؤ جاری ہے۔

ان حالات میں مسلمان اہل علم کے سامنے جب جدید مسائل کے حل کے لیے اجتہاد اور نصوص

قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح جدید کی بات آتی ہے تو درج ذیل دو رویے سامنے آتے ہیں:

پہلا یہ کہ کچھ لوگ جنہوں نے مغربی ممالک کے اداروں میں تعلیم حاصل کی ہے یا مسلمان ممالک میں مغربی طرز اور مغربی فکر وتہذیب کے مطابق بنائے گئے تعلیمی اداروں میں تربیت پائی ہے یا اس فکر و تہذیب سے متاثر و مرعوب ہیں وہ نصوص قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح جدید اس طرح کرتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات مغربی فکر کے مطابق ہوجائیں، اس کا چولا پہن لیں اور ان کی کتر بیونت کر کے انہیں مغربی فکر وتہذیب کے مطابق بنا دیا جائے جو ان کے نزدیک حق ہے، بلکہ معیار حق ہے اور ان کے نزدیک دنیاوی ترقی کی اساس اور ضامن ہے۔

دوسرا رویہ یہ ہے کہ اسلامی اصول وضوابط پر قائم رہا جائے۔ جن باتوں پر امت چودہ سو سال سے عامل اور متفق ہے انہیں نہ چھیڑا جائے (اجماع)۔ اجتہاد اور تعبیر وتشریح نو کی جہاں ضرورت ہو وہ ضرور کی جائے لیکن اپنے پیرامیٹرز کے مطابق اور اپنے پیراڈائم میں رہتے ہوئے۔ اسلام مخالف افکار و تہذیبوں کو اصولی طور پر رد کر دیا جائے اور ان سے صرف محتاط استفادہ کیا جائے اور صرف وہ چیز ان سے لی جائے جو ہماری فکر وتہذیب کے خلاف نہ ہو اور فروعات وتحسینیات میں اگر کوئی چیز ان سے لی جائے تو پہلے اسے اپنے مزاج میں ڈھالا جائے اور اپنی ضرورت کے مطابق بنایا جائے۔

گویا پہلا اصول یہ ہے کہ اگر **زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز** (اگر زمانہ تجھ جیسا نہیں ہے تو تو اس جیسا ہوجا) اور دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر **زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ ستیز** (یعنی اگر زمانہ تجھ جیسا نہیں ہے تو تو اسے کوشش سے اپنے جیسا بنا لے)۔ یعنی پہلا اصول یہ ہے کہ زمانے کے مطابق ڈھل جاؤ اور اپنے آپ کو بدل کر اس جیسا بنالو (اور یہ اصول بزدلوں، کوتاہ ہمتوں اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں کا ہوتا ہے) اور دوسرا اصول ~~یہ ہے کہ زمانے کو اپنے مطابق ڈھال~~ لو، اسے بدلنے پر مجبور کرو نہ کہ خود بدل کر اس جیسے ہوجاؤ (یہ اصول جواں ہمتوں، بہادروں اور حریت فکر کے متوالوں کا ہوتا ہے)۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پہلا اصول غلط ہے اور اسے ٹھکرا دینا چاہیے اور دوسرا اصول ٹھیک ہے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ہم اپنے ہاں سرسید، قادیانی غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی وغیرہ کو اسی لیے غلط قرار دیتے ہیں کہ وہ پہلے اصول پر عمل کرتے ہوئے نصوص قرآن وسنت کی تشریح جدید کرتے ہیں اور ترکی کے اس حدیث پراجیکٹ کے بارے میں بھی ہمیں یہی خدشہ اور تشویش ہے کہ کہیں اس کے کارپرداز بھی اسی مذکورہ پہلے اصول پر عمل پیرا نہ ہوں جیسا کہ ترکی کے محکمہ مذہبی امور اور اس پراجیکٹ کے نائب صدر پروفیسر محمد گومز نے (جو برطانیہ سے فارغ التحصیل ہیں) رائٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے حدیث میں سزاؤں

کے حوالے سے کہا کہ'اس سلسلے میں اسلام کو غلط سمجھا گیا ہے۔آپ سلطنت عثمانیہ کے چھ سو سالہ دور میں ایک مثال بھی نہیں دکھا سکتے کہ کسی شخص کو ارتکاب زنا کی بنیاد پر سنگسار کیا گیا ہو یا کسی چور کا ہاتھ کاٹا گیا ہو (صفحہ ۲۱)اور برطانوی نومسلم یوسف اسلام کی لمبی داڑھی اور عربی جبے کے مقابلے میں اپنی بے ریشی اور سوٹ پہننے کا دفاع کیا ہے(صفحہ ۲۰)اور اپنے علمی کام کو اس کام کا تسلسل قرار دیا ہے جو ترک جمہوریہ کے قیام کے آغاز (۱۹۲۴ء) میں کیا گیا تھا (ص ۲۲)۔تاہم یہ محض ایک خدشے کا اظہار ہے اور جب تک ترکی میں کیا گیا کام سامنے نہیں آتا اس پر کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی۔بلکہ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ کرے سارا خدشہ غلط ثابت ہو اور ترکی میں کیا گیا کام جینوئن اجتہاد پر مبنی ہو نہ کہ تجدد اور مغرب کی نقالی پر۔

کتابچے پر قیمت درج نہیں۔اسے البصیرہ ۲۹۹، سٹریٹ ۷۶، ۹/۳۔جی، اسلام آباد سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔فون نمبر ۲۸۵۱۴۰۹۔۲۸۵۳۳۸۲۔۰۵۱

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کلؐ جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا!

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طاہا